

شانہ چوہدری

جنگ و تارک

”افوہ ایک تو ان محترمہ کو بہت جلدی ہوتی ہے آنے کی۔“ رائے نے دھوپ کی نظر نہ آنے والی ٹھوس شخصیت سے گویا مکالمہ شروع کیا۔

”جب سے ہم اس فلیٹ میں آئے ہیں عجیب و غریب اتفاقات دیکھنے کو ملے ہیں۔ یہاں کی چیزیاں جلدی اٹھ جاتی ہیں، خورشید میاں کو طلوع ہونے کی جلدی ہوتی ہے، گھر کا راشن جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ بجلی اور پانی پر اس بلڈنگ سے رخصت ہونے کی عجلت سوار ہوتی ہے۔ ادھر کی تو ہر شے جلدی میں ہے حتیٰ کہ انسان بھی۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں اٹھ کر چیل ڈھونڈنے لگی امی نے ذرہ برابر توجہ نہ دی۔

جانتی تھیں صبح جلدی اٹھنے پر اسے خفقان ہو جاتا ہے۔ روز کا معمول تھا۔ آج کی بات تھوڑی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے بھی اسی بیزاری و ناگواری سے کام لیا کرتی تھی اور اب جبکہ جاب کرتے ہوئے دوہرے ہو گئے تھے ابھی بھی ہنوز وہی انداز تھے۔ رائے یوں بھی نئی جگہ آ کر خوش نہیں تھی۔

”مجھے فلیٹوں کی زندگی سے بڑا خوف آتا ہے امی! اتنی تنگ و تاریک وحشت زدہ اور ڈراؤنی زندگی۔“ وہ جھنجھری لے کر کہتی۔

”فکر نہیں کرو۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہ بلڈنگ بہت خوب صورت اور جدید ہے۔ نئی نئی بنی ہے اور اس میں بہت سی سہولتیں ہیں۔“ وہ اسے بہلا لیتی۔

”مگر ہم اپنا گھر چھوڑ کر فلیٹ میں کیوں جائیں۔“

”رہو بیٹی! اٹھ جاؤ۔ دفتر نہیں جانا کیا۔“ امی کی بوڑھی نقاہت بھری آواز سحر دم خواب خرگوش کے مزے لیتی رائے کو بری طرح جھنجھلا گئی تھی۔

”اتنی جلدی ابھی تو سوئی تھی۔“ وہ مندی مندی آنکھوں کو بمشکل کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ امی نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے ہٹا دیے تھے۔ ساوہ سا چھوٹے سائز کا یہ کمرہ جو سنگل بیڈ، دو کرسیوں اور ایک میز پر مشتمل تھا روشنی کی تیز شعاعوں سے بھرتا چلا گیا۔

”باہر دیکھو ذرا، کتنی دھوپ نکل آئی ہے۔“

کاولٹ



اس کی انجمن بھری نظریں ای کو افسردہ کر دیتیں۔
 ”اب یہ ہمارا گھر نہیں رہا ہے بی بی!“ ان کے منہ سے بے اختیار سرود آہ نکل جاتی۔ رائے کے ابو نے ایک باعزت سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے کسی دوست سے ایک خطیر رقم ادھار لی تھی کہ دوبار شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی اس میں بھونک دی تھی۔ مگر بد قسمتی سے کاروبار نہ چل سکا اور اپنے روپے کے ساتھ ساتھ دوست کی رقم بھی ڈوب گئی۔ واپس تو بہر حال لوٹانا تھی۔ چھ ماہ کا وعدہ تھا اور اب دس ماہ گزر چکے تھے۔ مسلسل تقاضوں نے ابو کو متفکر کر دیا تو بہت دھمکیوں پر آگئی۔ ابو نے قرض کے اس بھاری بوجھ سے نجات پانے کے لیے ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا پناہ بتایا ذاتی گھر بیچ دیا۔ دوست کو رقم دینے کے بعد جو تھوڑے بہت پیسے بچے۔ اس سے بی بی تین تھری کے علاقے میں اپنے والوں کی پانچ ایک میں ایک سال ایڈوانس پے منٹ کے بعد قلیل کرائے پر لے لیا۔ مگر ابو کو نئے گھر میں پانچ سال اس آسکا۔ ایک ماہ بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اسی وجہ سے رائے کو ایف اے کے دو سال بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ ہونے کے بجائے جاب کی تلاش پر غور کرنا پڑا تھا۔
 باپ کی وفات کے پانچ ماہ بعد اسے کمرشل بورڈنگ ہائس اور سیلائی کرنے والی کمپنی میں بطور سیکرٹریز جاب مل گئی۔ ای کو مجبوری کے عالم میں اسے نوکری کی اجازت دینا پڑی تھی کہ ان کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ گھر بار چلانے کے لیے خود میدان عمل میں آسکتیں۔
 ”تم شام کو کتنے بجے تک آؤ گی؟“ امی نے گھی میں ترہتر اٹھا اس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔
 ”کچھ کہہ نہیں سکتی امی۔“ اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر ایک لمحے کو سوچا۔
 ”پتا نہیں آج میری ڈیوٹی کمرشل ایریا میں ہوگی یا ریزی ڈنشل ایریا میں پھر ڈیوٹی نمنا کر ہم سب کو شام پانچ بجے لیاقت صاحب کے آفس میں جمع ہو کر

رپورٹ دینا ہوتی ہے۔ لیاقت صاحب ہمارے سچے کے انچارج ہیں۔“
 ”مجبوری کا نام شکر یہ ورنہ سچ پوچھ تو مجھے تمہاری جاب کی نوعیت پسند نہیں آئی۔ ایک جگہ تک کر سکون سے بیٹھ کر کرنے والا کام ہو تو بات بنے۔ یہ صبح سے شام تک لور لور پھر کر چیزیں بیچنا ایک لڑکی کے لیے قطعی مناسب نہیں لگتا۔“ امی کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ بے بسی کے تاثرات تھے۔
 ”چیزیں بیچتے تھوڑی ہیں۔ انہیں گھر کے افراد اور دفاتر کے منتظمین سے متعارف کرواتے ہیں۔ تاکہ وہ ہماری کمپنی کے معیار اور قیمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستقل خریدار بننے پر آمادہ ہو سکیں۔“ اس نے ایک طرح سے ماں کو سمجھایا۔
 ”اور اس کام میں یہ فائدہ ہے کہ جتنے زیادہ خریدار ڈھونڈیں گے اسی حساب سے طے پانے والے سودے کا بیس فیصد ہمیں ملے گا۔ گویا اپنی کارکردگی کی بنا پر جتنا چاہیں منافع کما سکتے ہیں۔“ یہ دنی الفاظ تھے جو کمپنی نے جاب کے سلسلے میں اخبار میں دیے جانے والے اشتہار میں استعمال کیے تھے اور جسے پڑھ پر رائے انٹرویو دینے لگی تھی۔
 ”خدا جانے یہ سچ بھی ہے یا محض جھانسنہ دیا ہے۔“ امی کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔
 ”اب کیا کیا جاسکتا ہے امی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”نہ سر پر باپ ہے نہ بھائی اور نہ کوئی عزیز رشتہ دار جو اس سچ بھٹوت کی تحقیق کروائے یا پھر برہہ کر ہمیں سارا دے۔ جو کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔ ایک ایف اے پاس لڑکی کو ”معزز زانہ“ قسم کی جاب مل بھی کیسے سکتی ہے۔“
 ایف اے کے بعد اس کا بی اے میں ایڈمیشن لینے کا ارادہ تھا مگر ان ہی دنوں اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ تقریباً ایک ماہ تک بستر سے نہ اتر سکی تھی۔ بعد میں ٹھیک ہوئی تو داغ کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ امی نے تشفی کرائی کہ اگلے سال لے لیتا۔ اگلے سال ابو کاروبار کے سلسلے میں پھنس گئے اور پھر گھر والوں پر ایسی افتادوں کی کہ پڑھائی چھوڑ کھانے پینے کا بھی ہوش

نہ رہا تھا۔ اسی آخر اتھری میں اگلا سال بھی ضائع ہو گیا۔
 ”میں سوچ رہی ہوں۔ جاب میں ذرا سیٹ ہو جاؤں پھر ریسٹیوٹ لی اے کروں گی۔ تعلیم بغیر ترقی نہیں۔“ اس نے سوچتی نظروں سے اسی کو دیکھا۔
 ”ارے نو بجتے ہیں میں منٹ رہ گئے ہیں اور مجھے دو گاڑیاں بدل کر دفتر پہنچنا ہے۔“ جو نی وال کلاک پر نظر پڑی وہ اس رنگ کی طرح اچھلی تھی۔
 ”تمہو کے تو واپسی پر جلدی آجانا۔ جو تھے فلور والی شریا کے بیٹے کو چوٹ لگی ہے۔ اس کی عیادت کر آئیں گے۔“ وہ چادر اوڑھ کر سیاہ ہینڈ بیک لیتے ہوئے دروازے سے نکلی تو پیچھے سے امی نے ہانک لگائی تھی۔
 ”اچھا۔“ خدا جانے اس کی ”اچھا“ امی تک پہنچی تھی یا نہیں۔ وہ تو دھڑا دھڑ سیڑھیاں طے کرنے میں مشغول تھی۔ یہ بلڈنگ چھ منزلہ تھی اور ان کا فلیٹ پانچویں منزل پر تھا۔
 ”اؤہ! کیا تھا جو لفٹ لگوا دیتے۔“ ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں اس آنے جانے کی مشقت میں۔ ”وہ جی ہی جی میں عیادت بنانے والوں کی شان میں قصیدہ گوئی کر رہی تھی۔ سیڑھیوں پر نیم تاریکی تھی۔ اسی دھن میں خبر نہ ہوئی کہ کب پیچھے سے اوپر آنے والے فولادی جسم سے ٹکرائی۔
 ”دو ف۔“ فکر اس زور کی تھی کہ اس کی آنکھوں کے آگے تر مرے ناچ گئے۔ وہ بری طرح لڑکھرائی اس سے پہلے کہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی منہ کے بل نیچے گرتی۔ اس شخص نے اپنا توازن بحال رکھتے ہوئے اسے بازوؤں میں تھام کر قابل افسوس حد تک بھیا تک موت سے بچایا۔
 ”کیا آپ اپنے ہوش و حواس اوپر چھوڑ آئی تھیں۔“
 گرفت کی طرح لہجہ بھی سخت اور پھر ملا تھا۔ یا اللہ انسان ہے یا سنگ و آہن سے بنا مجسمہ۔ وہ جکراتے سر کو تھام کر بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی ہوئی تھی۔ مردانہ آفٹر شیو لوشن، شکریت کی خوشبو اس کے بہت قریب موجیں مار رہی تھی۔

”خود بھی تو ریلوے کے انجن کی طرح چھکا چھک اندھا دھند بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ آپ ہی آنکھیں کھلی رکھنے کی زحمت کر لیتے۔“ وہ خشک لہجے میں جواباً ”گویا ہوئی۔ اسے سنبھلتے دیکھ کر موصوف نے فوراً ہی اپنے بازو ہٹا لیے تھے۔ اس کی جوابی جارحیت پر وہ شعلے کی طرح بھڑک گیا۔
 ”کیا مطلب ہے آپ کا“ میں جان بوجھ کر آپ سے ٹکرایا تھا؟“
 یا اللہ میں کہاں پھنس گئی۔ اس نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ کوئی بھی، کسی بھی فلور سے اوپر یا نیچے آسکتا تھا۔ آ رہا ہو گا یا آنے والا ہو گا۔ صورت حال اتنی ”حسین“ ہرگز نہیں تھی کہ وہ یہاں رک کر اپنا تماشا بنواتی۔ خیریت اسی میں تھی کہ چپ چاپ اپنی راہ لیتی۔ سو وہ اچھنے کے بجائے ایک سائیڈ سے ہو کر جلدی جلدی بقیہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے آگئی۔
 کچھ دور چل کر اسے سوزو کی مل گئی۔ پچھلی سیڑھیاں شخص ٹھنڈا کر بیٹھنے کے بعد وہ فکر مندی سے کلائی کی گھڑی دیکھنے لگی۔ نو بجتے ہیں دس منٹ رہ گئے تھے۔ سوزو کی کو کراچی کمپنی اسٹاپ تک پہنچنے میں اتنا ہی وقت لگتا۔ وہاں سے مزابلس پر بیٹھ کر آئندہ سٹرل ایریا پہنچنے میں مزید پندرہ منٹ لگتے تھے۔
 آج کے دن کی نحو تیں تو ابھی سے سامنے آگئی ہیں۔ اس نے جھٹائے ہوئے انداز میں سوچا۔
 اسی لمحے سوزو کی کے پیچھے آنے والی ہونڈا سی ڈی سیو نی پر نظر پڑی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
 ”کیا یہ شخص میرا چچا کر رہا ہے؟“ اس نے ڈھڑکتے دل سے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کی رنگت گندمی تھی۔ اونچی کھڑی ٹاک اس کی ضدی اور اٹل طبیعت کا پتہ دیتی تھی۔ چاکلیٹی لمبے دار کھنڈے بال ہوا کی آنکھیلیوں۔ سے ہلکے ہلکے اڑ رہے تھے۔ دیکھنے میں وہ ایک نومند اور مضبوط قد کاٹھ کا مرد دکھائی دیتا تھا۔
 پریشانی فطری تھی۔ کیا سیڑھیوں پر ہونے والی اس سرسری سی جھڑپ کا اس نے اتنا اثر لیا ہے کہ بدلہ لینے کے لیے کسے کشاں کشاں پیچھے چلا آیا؟ رائے کے

ماٹھے پر بسنے کے قطرے نمودار ہونے لگے
خدا خدا کر کے کراچی کمپنی اسٹاپ آیا تو اس
تعاقد سے جان چھوٹی اتفاق سے اسے ایک منزل میں
سیٹ مل گئی جو جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔
سیون اپ اسٹاپ پر بس مسافر اتارنے کے لیے رکی تو
اس نے یونہی گردن موڑ کر شیشے سے باہر دیکھا۔ اسے
یکدم جھٹکا لگا۔

”اوہ“ وہی ہونڈا موٹر سائیکل کچھ دور آگے
ٹرنک سگنل پر رکی ہوئی تھی۔ اس شخص کی اس کی
سمت پشت تھی مگر سفید لائنوں والا گرے سوئٹر
ڈارک گرے جینز اور جوڑے شانوں نے جیسے خود بخود
موٹر سائیکل سوار کی پہچان کرا دی تھی۔ آگے سوئی
گیس اسٹاپ پر اسے اترنا تھا اور اس کے اوسان ابھی
سے خطا ہونے جا رہے تھے۔

سائیس برابر کرتے ہوئے اس نے بہت احتیاط و
آہستگی سے دھیرے دھیرے دائیں سے بائیں طرف
نگاہ کی۔ موٹر سائیکل آگے نکل گیا تھا۔

”شکر ہے خدا یا۔“ اس نے جھرجھری لے کر
بڑے آہنی گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس
نمارت کے دو دروازے تھے ایک اگلا دو سرا عقبی
دونوں کے آگے سڑک تھی۔ اس لیے آمدورفت میں
بہت سہولت ہو جاتی تھی۔ اگلا حصہ کمپنی کے مرکزی
دفتر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں سامان کی ترسیل کے
لیے کاروباری لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ رائے کا کام اسی
دفتر تک محدود تھا۔ پچھلے حصے میں فیکٹری تھی جہاں
سامان بنایا جاتا تھا۔ اس کا انتظامی انچارج اسفندیار
تھا۔

”اسلام علیکم“ آئی ایم سوری سر! میں کچھ لیٹ ہو
گئی۔“ اس نے ساٹھ کے بیٹے کے بھاری تن و توش
کے مالک لیاقت صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے
ہی جھکی معذرت طلب کر لی۔

وہ اسے دیکھ کر خفیف سا مسکرائے اور عینک اتار کر
میز پر رکھ لی۔

”یہ ”دیری“ یقیناً“ قابل تعریف ٹھہرتی اگر تم نے
واقعی اس سے غائب اٹھایا ہوا۔“

”کیا مطلب سر!“ وہ حاضری رجسٹر پر سائن کرنے
کے لیے جھکی تھی۔

”مطلب تو صاف ظاہر ہے نہ چہرے پر ڈنڈہ نہ
زلف میں پھول نہ لباس میں رنگینی تم نے تو کسی
ایک انداز میں بھی خاطر خواہ تبدیلی نہیں کی۔“ انہوں
نے افسوس سے سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے سر! اس کی ضرورت نہیں ہے اور
نہ میری ہی اجازت دیں گی۔“ وہ سائن کر کے رجسٹر بند
کرنے کے بعد قلم میز پر ڈالتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی۔

”دیکھو بھی“ جس طرح تیار کردہ مال کو قابل توجہ

بنانے کے لیے اس پر خوب صورت رہنمائی پیپر
چڑھایا جاتا ہے اس کی دیدہ زیب پینٹنگ کی جاتی ہے
اسی طرح اسے فروخت کرنے کے لیے دکان اور دکان
دار کا پرکشش و جاذب نظر ہونا لازم سمجھا جاتا ہے۔

گاؤں خریدنے سے پہلے بیچنے والے کا جائزہ لیتے
ہیں۔“ لیاقت صاحب اس کی سنجیدگی بھانپ کر
خوشامد انداز اختیار کر چکے تھے۔

”یہ بات صرف تم سے ہی نہیں کہتا۔ فرحت ربی
’تانیہ‘ اکمل، جواد وغیرہ کو دیکھ لو وہ بھی تمہارے شعبے
میں کام کرتے ہیں۔ کیسے سر سے پیر تک سجے بنے
نکھرے ستھرے پھرتے ہیں۔ کمرشل ایریا کی طرف
نگلیں تو ہر کمپنی اور ایجنسی میں پذیرائی حاصل کرتے
ہیں۔ دفتر ہو یا دکان لوگ اسیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

وہ کامیاب سووے بازی کے بعد لوٹتے ہیں اور ریزی
ڈنشنل ایریا میں جا میں تو گھر کی خواتین ان کی چھے دار

باتوں اور شائستہ و مہذب انداز سے متاثر ہو کر چیزیں
خریدتی ہیں۔ انہیں آرڈر دیتی ہیں۔ یہی اچھے اور

کامیاب سیلز ایگزیکٹو کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ میں چاہتا
ہوں تم بھی یہی ہنر اختیار کرو تاکہ تمہیں زیادہ سے

زیادہ گاؤں ملیں۔ کمپنی کو جتنے زیادہ سووے لا کر دو گی
اتنا ہی کملاؤ گی اور ایک وقت آئے گا کہ تم اپنی

صلاحیتوں کی بنا پر بہت آگے نکل جاؤ گی۔ تمہارے
پاس اپنا بنگلہ ہو گا۔ اپنی کار ملازم اور بہت کچھ۔“

وہ بہت سلیقے طریقے سے اس کی آنکھوں میں
خواب سجانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ شاید ان

خوابوں کی گرفت میں آ بھی جاتی اگر لیاقت صاحب
کے لب و لہجے اور انداز میں واقعی خلوص ہوتا۔ نہ
جانے کیوں اسے یوں لگا جیسے وہ دانہ ڈال کر چڑیا پھانسنے
کا اہتمام کر رہے ہیں۔

”مجھے بہت آگے نکل کر تنہا رہ جانے سے ڈر لگتا
ہے سر۔“

وہ سرو لہجے میں کہہ کر اجازت لیتی ہوئی باہر آ گئی۔
ایوٹی تو وہ معلوم کر ہی چکی تھی۔ اسے آج کمرشل ایریا
میں جانا تھا۔

باس کے کمرے کا چوبی دروازہ کھلتے ہی خوشبوؤں کی
لہریں سی باہر نکلتی ثناء کے ساتھ آئی تھیں۔

”ہیلو رائے۔“ رائے ہال کمرے میں کمپنی کا سامان
سے بھرا مخصوص بیگ کندھے پر لٹکا کر باہر نکلنے کو تھی

۔ جب باس کی طرح دار حسین و جمیل سیکرٹری ثناء نے
ہال کے ایک سائیڈ پر کاؤنٹر کے پیچھے رکھی ریوالتنگ

چیر پر بیٹھے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”ہیلو مس ثناء! کیسی ہیں آپ؟“ وہ ”موتا“
مسکرائی۔ ثناء عمر کے اعتبار سے پینتیس برس کی لازم

ہو گی مگر دیکھنے میں ہرگز بھی پینتیس سے زائد کی نہیں
لگتی تھی۔ دلی بکلی بے حد اسٹارٹ پر کشش فیکٹری کی

مالک اس عورت میں نجانے کیا تھا کہ باس نے پچھلے
دس برس سے اسے مستقل اپنی سیکرٹری بنا کر رکھا ہوا

تھا۔ بلکہ وہ ایک طرح سے کمپنی کی سیکنڈ باس تصور کی
جاتی تھی۔ باس اس کی بہت مانتے تھے۔ اسی وجہ سے

لوگ اس سے دبتے تھے۔

”ہم تو ٹھیک ہیں۔ تم سنناؤ کیسی جا رہی ہے جا۔
کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“ ثناء کی ہنسی میں مرووں کے

لیے اک خاص دلربائی اور ظلم تھا۔

”نہیں شکریہ۔“

”چھا سنو فرمان اینڈ سنز کے آفس کا چکر ضرور لگاتا
ہاں نے خصوصی تاکید کی ہے۔ کچھ دن پہلے ان کی

بات ہوئی تھی فرمان صاحب سے۔ وہ ہماری کمپنی کی
پروڈکٹس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔“ ثناء کی ہدایت پر

سرہلاتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔

برس کی تندرست و توانا موٹے موٹے نقوش کی حامل
طاہرہ نے اسے دیکھ کر جھاڑو ایک طرف رکھ دی تھی
تاکہ اس پر گرد نہ پڑے۔

”و علیکم السلام خالہ کیا حال ہیں تمہارے۔“ رائے
اس سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ یہ کمپنی کی بیرونی
ملازمہ تھی رائے نے شروع شروع میں ایک دو مرتبہ
اسے از خود سلام کیا تھا۔ بیوی کو سلام میں پہل کرنے
کی تربیت امی نے گویا اس کی گھٹی میں ڈال دی تھی۔
ملازمہ اس کے حسن سلوک سے اتنی متاثر و مسرور
ہوئی کہ اب دیکھتے ہی منسوب ہو جاتی تھی۔ اکثر اس کی
شہسپا کرادھر ادھر کی باتیں بھی کر لیتی تھی۔
”بی بی! اس جگہ کے آگسٹس؟“ اس نے اکثر
محسوس کیا تھا کہ وہ اس کی یہاں نوکری پر خاصی متوجہ
و متفکر رہتی تھی۔

”نوکری تو کرنا ہے ناں خالہ! جہاں قسمت لے
جائے۔“ وہ پچھلے پن سے مسکراتی تھی۔
”پر تمہارے جیسی لڑکیوں کے لیے یہ کام صحیح
نہیں ہے بی بی! لڑکی ذات ہو۔ سارا سارا دن سڑکوں
بازاروں اور گلی محلوں میں تنہا پھرتا اور طرح طرح
کے مردوں کے پاس جانا بھیک نہیں لگتا۔ آج کے
زمانے میں بھیڑیے اور شکرے جنگلوں کے بجائے
آبادیوں میں نکل آئے ہیں شکار کے لیے۔“ طاہرہ اکثر
موج پا کر جیسے کہہ دیتی تھی۔
”تم فکر نہیں کرو! خالہ میں ان سے پنہا جانتی
ہوں۔“

”بھئی آخر کب فارغ ہوں گے آپ کے فرمان
صاحب۔“ ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اس کا صبر
جواب دے گیا تو وہ تیز میک اپ اور گھنٹیا سے خیلے
والی ریسیٹنٹ لڑکی سے الجھ پڑی تھی۔
”دو منٹ سر چاہتے ہیں یا کُل فارغ ہو کر آپ سے
بات کریں۔“ وہ چمک چھلوا کر کام پر جت گئی۔ رائے
نے دل ہی دل میں فل اسپینڈ میں اسے گالیاں دیں۔
صبح سے کمرشل ایریا میں خوار ہو کر ویسے ہی اس کی
برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ عجیب و غریب نظریں

کچھ کہنی ہوئی، تولتی ہوئی، جسم میں کھب جانے والی
ٹھٹھرا دینے والی نظریں جن سے عجیب خوف سا
محسوس ہوتا تھا۔

کمرشل ایریا میں پہلی ڈیوٹی ہی بھیانک تجربہ ثابت
ہوئی تھی۔
”بس فرجان اینڈ سنز آخری ٹارگٹ ہے“ اس کے
بعد سیدھا آفس واپس جاؤں گی اور لیاقت صاحب کو
صاف جواب دے دوں گی کہ میں آئندہ کمرشل ایریا
میں ڈیوٹی نہیں کروں گی۔ اگر انہوں نے چوں چرا کی تو
میں شہداء سے بات کروں گی۔“
اس سے پہلے کہ اس کے خون کا ٹکٹہ کھولاؤ آخری
پوائنٹ تک پہنچتا چمک چھلوانے اندر جانے کا اشارہ
کر دیا۔

اسپرنگ دار براؤن دروازہ اس کے اندر قدم رکھتے
ہی آٹومٹک طریقے سے بند ہو گیا تھا۔ فلی فرنشنڈ
آرام دہ اور پر تعیش کمرہ اور پاس کی سینٹ پر بیٹھا
درمیانی عمر کا پختہ و جماندہ لمبا چوڑا وجود۔ غالباً یہی
فرمان صاحب تھے۔
”جی مس پلینز تشریف رکھیے۔“ اس کے لمبے
نری تھی۔ رائے ہچکچاتے ہوئے ٹیبل کے سامنے والی
کرسی پر بیٹھ گئی۔ جانے کیوں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس
ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا ایک پل رکنے بغیر یہاں سے
نکل جائے۔

فرمان نے فون پر جانے کا آرڈر دیا تو وہ چونکی۔
”پلینز جناب! اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس
نے روکے سے انداز میں کہا۔
”تکلف نہ کیجیے آپ آرام سے بیٹھیے۔“ وہ
بہت بھرپور نظروں سے اس کا صحیح دیکھ رہا تھا۔
”میں آپ کو اپنی کمپنی کی پروڈکٹس دکھاتی
ہوں۔“

”پروڈکٹس بھی دیکھے لیتے ہیں پہلے آپ کو تو خیر۔“
وہ اک ترنگ میں کہتا ہوا اچانک بات بدل گیا۔ رائے
جزبہ ہو گئی اور بیگ کھول کر کمپنی کی مصنوعات
دکھانے لگی۔
”سر! ہماری کمپنی نے اعلا کو الٹی کی مختلف چیزیں

”سیر! ہماری کمپنی نے اعلا کو الٹی کی مختلف چیزیں

عارف کروائی ہیں، مثلاً ”شیمپو“ ”سوپ“ ”ڈٹر جنٹ
ایڈیشن اور۔۔۔“

”ایک منٹ، ایک منٹ بار! سانس تو لے لو۔“ وہ
اسے انداز سے مسکراتا ہوا سیٹ چھوڑ کر اس کی
طرف آیا تھا۔
”میرا خیال ہے جناب! آپ سنجیدہ نہیں ہیں۔
میں چلتی ہوں۔“

وہ لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کی آنکھوں میں
اسرتی معنی خیز چمک سے اس کے ارادے کو پہچان گئی
تھی سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔ ابھی سودا بھی طے
کے لیتے ہیں۔ بیٹھو تو سہی۔ اپنی کمپنی کی روایات
پر قرار رکھتے ہوئے آرام و سکون سے دو گھڑی ٹھہر کر
بات کرو۔“ وہ فوراً اس کی راہ میں مزاحم ہوا۔

”وہ اور ہوتی ہوں گی جو آپ کے حسب منشا اور
”من پسند“ انداز میں سودے کرتی ہوں گی۔ میں ذرا
مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ آپ ان ہی سے طے کر لیجیے
گا معاملات مجھے اجازت دیجیے۔“ اس سے پہلے کہ وہ
اسے روکنا فون کی بیل بج اٹھی۔ ”اس نے قبضہ لائے
ہوئے انداز میں فون اٹھایا رائے امداد میبھی کا فائدہ
اٹھاتے ہوئے لحوں میں باہر نکل آئی۔

”میرے خدا!“ لفت کے بجائے وہ گرتی بڑتی
سیڑھیاں طے کر کے بلڈنگ سے نکل کر سڑک پر آئی تو
اس کا بورا وجود پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔
جو بھی لڑکی ایسے کام کے لیے نکلتی ہوگی اسے یہی
مسائل درپیش آتے ہوں گے، کچھ حالات سے
سمجھوتہ کر لیتی ہوں گی، فرحت رولی اور تانیہ کی طرح
گا بہک کی حسب خواہش اسے لبھائی ہوں گی اور کچھ
ایڈجسٹمنٹ ہونے والی یہ فیلڈ چھوڑ دیتی ہوں گی۔ مگر
میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ مجھے اس جاب کی ضرورت
ہے۔

”میں بی عزت ضرور بچاؤ مگر تھوڑا سا اپنا رویہ نرم بھی
رکھو۔“ اس سے فرحت نے کہا تھا۔

”پلینز لڑکی بھی کچھ عزت ہوتی ہے۔ میں آپ

سے درخواست کرتی ہوں لیاقت صاحب سے کہہ کر
میری ڈیوٹی گھریلو سطح تک محدود کر دیں۔ میں وفاتر اور
کمپنیوں میں جا کر کام نہیں کر سکتی۔“
اس نے جاتے ہی حتمی انداز میں کہہ دیا۔
”کیا گھریلو سطح پر ایسا نہیں ہوتا؟ یا وہاں مردوں کی
”بے ضرر“ اقسام پائی جاتی ہیں۔“ شہاء بے ساختہ
مسکرائی تھی۔ ”بہر حال میں لیاقت صاحب سے بات
کروں گی۔ بے فکر رہو۔“

”شکریہ مس شہاء۔“ اس نے سکھ کا سانس لیا۔
”مگر ایک بات ضرور کہوں گی۔ مردوں کی دنیا میں
رہنا ہے تو پھر انہی کا سالا کف اشاکل اپنانا ہو گا۔ یہ
بے جا قسم کی شرم و حیا، جھجک اور وقیانویت کے ساتھ
تم ترقی نہیں کر سکتیں۔“
یا اللہ یہ ہر کسی کو میری ترقی و کامیابی کے لالے
کیوں بڑے ہوئے ہیں۔ وہ عاجز آکر سوچنے لگی۔
”مجھے دیکھو میں بسا اوقات کام کی غرض سے دو دو
گھنٹے پاس کے کمرے میں بند رہتی ہوں۔ ہمارے
درمیان طویل مذاکرات ہوتے ہیں۔ بہت سے
معاملات زیر بحث آتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی خود کو
نروس محسوس نہیں کیا۔ بولڈ ہو لڑکی اور نہ گزارا نہیں
ہو گا۔“

”خیال رکھنے اور نصیحت کرنے کا دوبارہ شکریہ مس
شہاء مگر میں ایک بات جانتی ہوں میں سن سب کی لیتی
ہوں۔ مگر کرنی وہی ہوں جو بذات خود مناسب سمجھتی
ہوں۔“
وہ مسکراتے ہوئے اسے آج کی کارکردگی دکھانے
لگی۔

اسی دوران تانیہ اور اکمل کسی کام سے شہاء کے
پاس آگئے۔ انہیں لیاقت صاحب نے بھیجا تھا۔
”مائی گڈنیں! اس کے بارے میں تو پروڈکشن
انچارج اسفندیار بی مکمل تفصیلات مراہم کر سکتے ہیں
۔ مسٹر اکمل! تم فیکٹری رابطہ کرو۔ میں بات کر لیتی
ہوں۔“ شہاء کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے پریشانی سے
گویا ہوئی۔

پھر وہ فون پر جت گئی۔ رائے نے نوٹ کیا تھا کہ

پروڈکشن انچارج سے بات کرتے ہوئے ثناء کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ حالانکہ وہ اختیارات میں سہرا لٹا سے بڑھ کر نہیں تھا مگر اس میں کچھ تھا کہ ورکرز مخاطب ہوتے ہوئے دھیان رکھتے تھے کہ وہ کہنی کا بڑا اہم پرزہ تھا۔

”مگر تم تھوڑی دیر کے لیے آجاؤ تو مجھے سہولت رہے گی۔“ ثناء کا انداز درخواست گزار کی دلا تھا۔ مگر حسب منشا جواب نہ پا کر وہ جھنجھلا سی گئی۔

”پنا اسٹنٹ لیجے کے بجائے خود زحمت کر لو تو نوازش ہوگی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ اس نے مایوسی و نیم دلی سے فون رکھ دیا۔

”مسٹر اسفندیار کا اسٹنٹ آ رہا ہے۔ اس سے بات کر لینا۔“ ثناء نے فون رکھتے ہوئے ڈھیلے سے انداز میں اکمل کو دیا بات دینے کا اشارہ کیا۔

”پھر بے بالکل پتھر۔“ وہ بڑبڑاتی رہی مگر رات کو بے ساختہ ہی گد گدی ہوئی۔ کوئی ایسا بھی ہے جو مس ثناء کے حسن کے حضور سجدہ ریزی سے انکاری ہے۔ اسے تجسس سا ہوا۔ پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں لگ گئی۔

فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی چادر اور بیک سنبھالا اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ بس آخری تاریکی کریمیں افق پر جلوہ افروز تھیں۔

اشاب گیٹ کے آگے ہی تھا سو وہ گھڑی ہو کر بے تابی سے دائیں طرف نظر گھما کر کسی مزدیاد و یکن کا انتظار کرنے لگی۔

کی مگرانی کرتا رہا ہے؟ چاہتا کیا ہے؟ یہ خدائی فوجدار ایسے گھنے اور پراسرار بندے سے تو مگر لیتے ہوئے بھی جی ڈرتا ہے۔

وہ قدرے رخ موڑ کر بے چینی سے گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ اسی ساعت وہ موٹر سائیکل سوار چند ٹانھے رک کر کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ بلڈنگ میں داخل ہوئی تو اس کی ہونڈا پہلے سے پارکنگ کے احاطے میں موجود تھی۔ اسے خواہ مخواہ ہی ٹھیک چھنے لگی۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ گھٹے گھٹے جھلائے ہوئے قدموں سے اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا جلدی آجانا۔“ امی چائے کا کپ اسے تھمتے ہوئے نرمی سے یاد دلانے لگیں۔ وہ کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم کے قالین پر پیر پارے بیٹھی تھی۔ یہ کمرہ کشادہ تھا۔ ایک طرف ایک برائیا سا صوفہ سیٹ بچھا تھا اور دوسری طرف دو چار کرسیوں والی چھوٹی سی چوکور میز تھی جہاں بیٹھ کر ماں بیٹی کھانا کھاتی تھیں۔ ایک کونے میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا۔ یہ چیزیں ابو نے یہاں آکر سینکڑوں پنڈ خریدی تھیں۔ اسے کھر کا بیش قیمت سامان تو قرض اتارنے میں بک گیا تھا۔

”کوشش تو بہت کی تھی امی۔ مگر کام زیادہ تھا اس لیے۔“ وہ رک کر ماں کو دیکھنے لگی۔ ”آپ گئی تھیں پھر ریا آتی کے ہاں۔“

”ہاں جانا ضروری تھا آخر کو حق ہمسائیگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے میرا ارادہ تھا کوئی میٹھی چیز بھی بنا کے لے جاؤں گی مگر نقاہت اتنی تھی کہ چوٹھے کے پاس کھڑا ہونا عذاب لگ رہا تھا۔“ امی اپنی وضع داری اور اخلاق سے مجبور تھیں۔ رائے مسکرا دی۔

”آج کیا پکایا ہے؟“

”تمہاری پسند کا مشرٹاؤ۔“

”زبردست۔“ اس نے نعرہ لگایا۔

”اور امی! ہم کھانا کھا کر واک کرنے چلیں گے۔ سامنے سڑک پر۔“ اس نے اشتیاق سے کہا۔

”میں جلد نہیں چل سکتی۔“ انہوں نے عذر تراشا۔

”سلام آباد کی سڑکیں تو رش کے لیے ترستی ہیں۔“ وہ بے بسی پڑی۔

”ملاقات دینیے بھی بہت بر سکون اور الگ تھلگ۔ کوئی رش نہیں ہو گا۔ بس آپ کو چلنا ہے۔“ اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

”اچھا بابا۔“ امی بھلا اس کی بات ٹال سکتی تھیں۔

”امی! آپ تھک تو نہیں گئیں؟“ شلتے شلتے اس نے کوئی چوتھی مرتبہ تشویش بھری آواز میں دریافت کیا تھا۔ وہ رات کی ٹھنڈی خوشگوار فضا سے جی بھر کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ایک شائقی سی رگ و پے میں اترتی جا رہی تھی۔ مگر اسے ہماراں کا بھی خیال تھا۔

”میں بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے چل قدمی کرتے ہوئے۔“ وہ فلیٹ کے کمرے سے۔ اب واپس چلنا چاہیے۔ ”وہ فلیٹ کے کمرے پہلی طویل خاموش سڑک کا چکر لگا کر واپس پلٹ آئیں۔“

پارکنگ ایریا میں ملگجاسا اجیارا تھا۔ ہونڈا کے پاس سے گزرتے ہوئے نجانے اس کے اندر کلن سی شفقناہ حس جاگی کہ اچانک بہت نور سے موٹر سائیکل کو دوسری طرف دھکا دے کر گرا دیا۔ اس کا خیال تھا گھاس پر گرنے سے کون سا زیادہ توڑ پھوڑ ہوگی۔ بس یہ ہے کہ موصوف صبح اٹھ کر بائیک کو لے لیا لیٹے دیکھ کر چیخ و نلب ضرور کھائیں گے اور اگر یوں کرنے سے بیک ویو مرر نوٹ جائے تو روپی آجائے۔ مگر

”سرالحمہ حیران کر دینے والا تھا۔“

”بھا کر قدرے پیچھے رہنے کا موقع مل گیا تھا۔ یوں ہائی جسم تو محفوظ رہا مگر دامن ٹانگ پوری کی پوری پیچھے آگئی تھی۔“

صورتحال کی یقینی کا اندازہ کرتے ہی رائے کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بائیک کی دوسری طرف وہ بیٹھا ہوا ہے۔ بلڈنگ کے نیچے فلور کی کھلی کھڑکی سے ایک صاحب بھاٹک کر فٹ پاتھ باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے بائیک اٹھا کر اسٹینڈ پر کھڑا کرنے کے بعد زمین پر لیٹے اس شخص کو ساراوے کر اٹھایا۔

”زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بیٹے ورنہ ہسپتال لے چلیں۔“

ای اس کے پاس بیٹھ کر فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔

”میں ٹھیک ہوں خاتون۔“ وہ ٹھٹھا ہونٹ دبا کر تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مد کرنے والے صاحب نے اپنی کھروالی کو کھڑکی سے پیغام دے کر ایک صاف کپڑا ڈیوئل اور کوئی مرہم منگوایا تھا۔

”عالیہ فرسٹ ایڈ کے ماہر تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے زخمی ٹخنے اور پیر کا فون صاف کر کے نئی باندھ چکے تھے۔ امی اتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ نیچے طور کے کچھ بچے بھی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ قیمت تھاجو کسی کو اصل سبب معلوم نہیں ہوا تھا۔ سب اسے اتفاقی حادثہ خیال کر رہے تھے۔“

”حالانکہ سوچنے کی بات ہے کیا خود بخود کسی جن نے موٹر بائیک اس پر اتار دی؟“ وہ بلڈنگ کی دیوار سے لگی کارروائی ملاحظہ کرتے ہوئے طے ہی طے میں حاضرین کی کم و بیش محفوظ ہو رہی تھی۔

”آپ کا شکریہ بہت ہے۔“ وہ لنگراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لہجہ عالیہ قدرتی طور پر روکھا اور سپاٹ تھا جو تشکر کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بھی بدلنے سے عاجز رہا تھا۔ رائے نے سوجا۔

”۴۰“ قیاط سے بیٹے اگر خود چلنے میں تکلیف محسوس کر رہے ہو تو الیاس بیٹا سارا دے کر لے جائے۔“ امی اس کی چل دی کہ کھڑکی پر مہل کے بائیک کی طرح نیچے آگئے۔ وہ تو اللہ نے بچت کی جو اسے بروقت چو

”۴۱“

”۴۲“

”۴۳“

”۴۴“

”۴۵“

”۴۶“

”۴۷“

بے چین ہو گئیں۔ الیاس غالباً ان صاحب کا نام تھا جنہوں نے اس کی مدد کی تھی۔
 "نہیں، مجھے سارے کی ضرورت نہیں ہے۔"
 اس کے قطعی انداز پر ای چپ ہو گئیں۔
 "آئیں ای! ہم بھی چلیں۔" وہ آئیں اشارہ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر چڑھ گئی۔ اسی غالباً "بیچے ہی رک گئی تھیں الیاس کی بیوی کے پاس۔
 رائے پانچویں منزل پر پہنچ کر اپنے فلیٹ کا تالہ کھول رہی تھی جب وہ رینگ کے سارے یہاں تک پہنچا۔ اس کا فلیٹ چھٹی اور آخری منزل پر تھا۔ اسے آتا دیکھ کر رائے کا خون خشک ہو گیا۔
 "وہ۔ بات سنیں۔" وہ سوکھے لبوں پر ہونٹ پھیرتے ہوئے معذرت کے لیے مناسب ترین الفاظ ڈھونڈنے لگی۔
 "سمجھ لوں گا میں آپ سے۔" اس نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے یہاں آتے ہی اویبا کی ظالم دلنواز خوشبو نے فضا کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا اگلی منزل کی سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد ایک لمحے کو مڑا۔
 "زیادہ تھیں بار خان بننے سے پہلے اپنے اطراف سے ہو سیکر رہنا سیکھیں ورنہ نقصان اٹھائیں گی۔" وہ اکھڑے ہوئے بے نیاز سے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔
 وہ جو اس کی دھمکی پر پتھر کر رہی تھی۔ اس عجیب و غریب تنبیہ پر ششدر کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔
 وہ کیا کہہ رہا تھا اور کس حوالے سے؟ وہ ایک نئی مصیبت میں پڑ گئی۔
 "بہت افسوس کی بات ہے رائے! مجھے تم سے ایسی شرارت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اگر خدا خواستہ وہ زیادہ زخمی ہو جاتا یا اسے فریاد کچھ ہو جاتا تو پھر؟" اسی جب انتہائی غصے میں ہوتی تھیں تو اسے پورے نام سے مخاطب کرتی تھیں۔
 "ای وہ۔" وہ کانپ کھجانے لگی۔ اس کی حرکت سب سے چھپ گئی تھی۔ مگر وہ بہر حال اس کی ماں سے چھپ گئی تھی۔
 10

تھیں۔ تمہ تک پہنچ گئی تھیں کہ اس نے جان بوجھ کر پائیک کو ٹھکرائی تھی۔
 "اگر اس کی ماں یا بیوی کو خبر ہو گئی تو وہ پوری بلڈنگ میں ہمارا تماشا بنادیں گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اتنی بد لحاظ اور بد تمیز لڑکی ہے کہ انسان کی جان لینے کے درپے ہو گئی۔" اسی کا موڈ بہت بگڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے انہیں ٹھنڈا کیا۔
 "ارے فرمان صاحب! کیوں خفا ہوتے ہیں۔ جناب آپ حکم کیجئے۔ ہم خود سر کے بل آجاتے ہیں آپ کا موڈ ٹھیک کرنے۔" شاہنشاہن ہنس کر فون پر بات کر رہی تھی۔
 "نہیں اس نے دوبارہ جانے سے انکار کر دیا ہے۔ سمجھا کریں ناں! باس خواجہ داؤد ڈال کر اپنی کمپنی کی ساکھ اور آج خراب نہیں کرنا چاہتے۔ وہ آپ کو بہت بھانگتی ہے۔ مانتے ہیں مگر دیکھیے ناں۔ کمپنی کے کچھ اصول ہوا کرتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرنے لگیں تو ہماری ساکھ خراب ہوگی۔" وہ سلیقے طریقے سے سمجھا رہی تھی۔
 "اوکے۔ اب آپ نے ہمارا اتنا مال خریدنے کا وعدہ کیا ہے تو پھر کچھ سوچنا پڑے گا۔ اچھا یہ بتائیے آپ کی رہائش کس علاقے میں ہے اور آپ کن اوقات میں گھر پر پائے جاتے ہیں؟ نیز یہ کہ آپ کے گھر میں کون کون رہتا ہے۔" وہ تفصیلات نوٹ کرتی رہی۔
 "ٹھیک ہے۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ لیکن آگے معاملہ سنبھالنا آپ کی ذمہ داری ہے ہم پر کوئی الزام نہیں آنا چاہیے۔" اس نے فون رکھ دیا۔
 رائے ایک اتنی الماری کھولے اس میں سردیے کھڑی تھیں۔ گفتگو کا کچھ حصہ پلے پڑا تھا جسے اس نے غیر اہم جان کر توجہ نہ دی۔
 "طاہرہ! اسفند صاحب کو بلاؤ فیکس کریں۔" رائے نے میز صاف کرتی طاہرہ سے کہا۔
 "نہی وہ۔" وہ جی تو آج نہیں آئے؟ اس نے واپس آکر اطلاع دی۔
 11

"کمال ہے۔ موصوف نے باس کو تائے بغیر چھٹی کر لی؟" وہ پیشانی پر گڑتی ہوئی تشویش سے بولی۔ پھر کچھ سوچ کر فون ملانے لگی۔
 "ہیلو یہ میں ہوں شاہنشاہن بھی فیکس کریں نہیں آئے آج؟" شاہنشاہن کے لہجے میں محسوس کی جانے والی اپنائیت اور شکستگی تھی۔
 "چھا میں سر سے کہہ دوں گی۔ ویسے برائے مانو تو میں آجاؤں تمہارے گھر؟"
 جواب یقیناً سخت اور نفی میں تھا جو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔
 "شاید میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں گریڈل پر ریسیور رکھ دیا۔ اسی لمحے باس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ان کے ایک ہاتھ میں بریف کیس تھا اور دوسرے میں گاڑی کی چابی۔
 "آپ میرے ساتھ چلیے مس شاہنشاہن! ایک اہم مینٹنگ ہے۔" وہ سنجیدگی سے اسے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔
 "ہاں سر۔" شاہنشاہن سے پیچھے آگئی۔ رائے نے پوچھی سرسری سے انداز میں دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ سرائیکٹر شاہنشاہن کو ہمراہ لے کر مینٹنگز پر جاتے تھے۔ ان کی عمر پینتالیس سے اڑتالیس برس کے درمیان تھی۔ سر کے گرے بال ان پر بہت سوٹ کرتے تھے۔ ان کا چہرہ صحت مندی کی سرخی لیے ہوئے تھا۔
 "خالہ! ایک بات تو بتاؤ۔" یہ مس شاہنشاہن کا اسفند یار صاحب کے ساتھ کوئی چکر ہے؟" رائے اس مزاج کی لڑکی تو نہیں تھی۔ مگر وہ عین مرتبہ شاہنشاہن کو اس شخص کے لیے بیک وقت بے قرار اور جھنجھلائی ہوئی دیکھ چکی تھی سو ایسا خیال آنا فطری امر تھا۔
 "ارے لی بی! اس عورت کا کسی کے ساتھ چکر نہیں ہے۔ طبیعت ہی ماشاء اللہ ایسی پائی ہے۔" طاہرہ اکتائی ہوئی آواز میں بولی۔
 "اب ایسا قہر تو نہ توڑو۔" شاہنشاہن مخفی اور ہوشیار لڑکی ہے۔ برس با برس سے باس کے ساتھ کام کر رہی ہے آفس کا اتنا کام سنبھالا ہوا ہے یہ بتاؤ یہ اسفند یار

صاحب کون ہیں کیسے آدمی ہیں۔" اس نے طاہرہ کا اعتراض رد کر دیا۔
 "بہت بھلا مانس ہے کم از کم زنانوں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔" طاہرہ نے جیسے بڑی سچے کی خونی بتائی۔ "چپ چاپ اپنا کام کر رہا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔ عورت تو عورت وہ تو سا بھی مردوں سے بھی گنے بنے جملوں سے زیادہ بات نہیں کرتا۔"
 "اور بھی رائے! کہاں ہو تم؟" لیاقت صاحب اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آگئے۔
 "مجھے کہاں جانا ہے سر! آپ کام بتائیے۔" اس نے بیزار کن انداز میں ان کا چہرہ دیکھا۔
 "کل تمہیں ایف مین کی طرف جانا ہو گا تمہاری حسب نشاء تمہیں ریزی ڈنیشنل ایریا دے دیا گیا ہے اب تو خوش ہو۔" وہ خوشاند انداز میں ہنسے۔ وہ کسی بھی طرح اس کو اپنی ممنون اور زیر بار دیکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ ان سے مسکرا مسکرا کر لگاؤٹ سے بات کرے۔ مخمور نظروں سے انہیں دیکھے۔ اس سے زیادہ کی انہیں تمنا بھی نہیں تھی۔
 "آج تو بڑی جلدی آگئیں؟" اسی اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔
 "آج میں کمپنی کے دفتر میں ہی رہی تھی۔ باہر کا کام نہیں تھا۔ لیکن سے بڑی خوشبو میں اٹھ رہی ہیں کیا بنایا ہے؟" اس کو تجسس لاحق ہوا چہن میں کھس کر دیکھی میں جھانکا اور بھنے ہوئے چکن میں سے ایک پس نکال لیا وہ سرے دیکھی میں سویا بن رہی تھیں۔
 "لگتا ہے آج میری دعوت کرنے کے موڈ میں ہیں۔ ویسے یہ آپ میں خاصی مثبت تبدیلی رونما ہوئی ہے۔" وہ شرارت سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چیت لگائی۔
 "ندی کیس کی۔ میں کب تمہاری فرمائش تالیتی ہوں ویسے یہ دعوت تمہاری نہیں کسی اور کی ہے۔" "کون؟"
 "وہی بچہ جو کل تمہاری شرارت و حماقت کے نتیجے

میں زخمی ہوا تھا۔ میں نے سوچا اس طرح حق ہمارا بھی ادا ہو جائے گا اور اسی بہانے تمہاری حرکت کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ سویاں پک جائیں تو اوپر دے آئیں گے۔ تم بھی چلنا میرے ساتھ۔

”آپ بھی حد کرتی ہیں ای! بھلا اس کے گھر میں کوئی نہیں ہے اس کی تیار داری کرنے والا اور اس طرح اچھا نہیں لگتا۔ وہ کیا کہیں گے کہ بھلا ہم اپنے بچے کو چکن اور سویاں بیٹا کے ہمیں دے سکتے؟“ وہ کوفت بھرے انداز میں بسمو کرنے لگی۔ مگر امی نے چنداں کان نہ دھرے۔

”وہ کچھ بھی کہیں اپنا فرض پورا کر کے ہم تو اپنے ضمیر کے آگے سرخرو ہو جائیں گے چلو تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلا دیا۔ جانتی تھی اپنی نرم مزاج جو امی ماں کو سمجھانے کا تھا۔

”کیا خبر مجھے سامنے دیکھ کر اسے زخموں پہ ٹمک چھڑکنے والا محاورہ یاد آجائے؟“

جانے سے پہلے اس نے بار بار سوچا تھا۔

”رنو بیٹی! اس کا نام کیا تھا بھلا۔“ معا امی بڑھیاں چڑھتے ہوئے سرگوشیاں انداز میں مخاطب ہوئیں۔

”تو مجھے بھی نہیں پتا امی۔ میں اپنی سہولت کے لیے انہیں موصوف کہہ لیا کرتی ہوں۔“ اس کی معصومیت پر امی ہنس پڑیں۔

بار بار بیل بجانے کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور کچھ زرد زرد سا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال بے ترتیب تھے اور سفید شلوار قمیض پر سلو میں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ دن سے کپڑے نہیں بدلے گئے۔ آنکھیں یقیناً بخار سے لال ہو رہی تھیں۔ بلکہ کھڑی ناک بھی قدرے لال تھی۔

”آ۔ آپ۔“ وہ انہیں سامنے پا کر سچ چکر اگیا تھا۔

”میں آپ کا حال دریافت کرنے آئی ہوں بیٹے۔“

”رے ہاتھ میں پکڑے ان پر سفید کروشیے والا روٹال دیکھ رہی تھیں۔

ڈالے ای بڑے غلوں سے گویا ہوئیں۔

”جی پلینز شریف لائیے۔“ وہ تذبذب کے عالم میں ایک طرف ہو گیا۔ اس کی آواز بھی کچھ بھاری بھاری لگ رہی تھی۔

”تمہارا زخم کیسا ہے بیٹے؟“

”اس میں سوچن ہو گئی ہے۔“ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ بے حد خوب صورت اور بیش قیمت غیر ملکی اشیاء سے سجائے کمرہ اپنے ٹیکس کی خوش حالی ضمانت دے رہا تھا۔ ماحول میں ادنیٰ کی مخصوص خوشبو چھٹی تھی۔

”یہ اپنی امی کو یا بیوی کو پکڑا دو بیٹے اور تم جا کر آرام کرو۔ ہم بھی بس دو چار منٹ بیٹھیں گے۔“ امی مختصر نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

”آپ ادھر ہی رکھ دیجیے۔ لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔“

اس نے ان کے ہاتھ سے ٹرے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

”میں اپنی خوشی سے بنا کر لائی ہوں۔ انکار نہ کرنا۔ اپنی امی کو بلاؤ بیٹے۔“

”مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو ان سے نہیں ملوا سکتا۔ میرے والدین کی وفات کو تیس برس گزر چکے ہیں۔“ اس نے بہت سنجیدگی و سادگی سے جواب دیا۔

”ہائیں۔“ امی کو دھچکا لگا۔ ”کوئی بہن بھائی بھی نہیں ہے۔“

”نہیں۔ میں اس وقت چھ ماہ کا تھا جب ایک امکسڈنٹ میں والدین کا انتقال ہوا۔“

وہ سیاہ سے خالی خالی لب و لہجے میں گویا ہوا۔ زخم اتار پاتا تھا کہ اب نشان بھی مندمل ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ ر سکون تھا۔ یا سیلف کنٹرول ہی اتنا تھا کہ مخاطب کو اس کے رویے میں احساس محرومی اور رنجیدگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”تو پھر تمہیں کس نے پالا۔“ امی کا دل گویا پھل کر پانی بن گیا تھا۔

وہ اب خصوصی توجہ و شفقت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”میں یتیم خانے میں پلا بڑھا ہوں۔ اٹھارہ سال کی عمر سے کام لگ گیا۔ اپنے پیروں پہ کھڑا ہوا تو یتیم خانہ چھوڑ کر گرائے پر کمرہ لے لیا۔ اللہ کا کرم ہے۔ آج مجھے ملازمت کرتے ہوئے بارہ برس گزر چکے ہیں۔ یہ فلیٹ اور گھر کا ساز و سامان میں نے اپنی کمائی سے خریدا ہے۔ عنقریب اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ نجبانے کس دھن میں وہ سڑیل مزاج کھردرا سا بندہ تفصیلی گفتگو کر رہا تھا۔ امی کی بیٹی کو ترسی ہامتا اس پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔

”تمہارے کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھے بیٹا۔“

”انہوں نے ہی یتیم خانے کی راہ دکھائی تھی۔“

اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

”خدا کسی کو اپنوں کے دکھ نہ دکھائے۔“ امی نے ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

”تمہارے بیوی بچے؟“

”اگر شادی کرتا تو ضرور ہوتے۔ مجھے افسوس ہے۔“ وہ بڑے تکلف سے مسکرایا تھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بڑی اجنبی اور عجیب نظر آرہی تھی۔

”ہاں بھئی کوئی بزرگ سر پر ہو تو بندہ ایسی خوشیاں دیکھتا ہے۔ خود بخود تو نہیں ہو جاتی شادی۔ خیر تم جی چھوٹا نہ کرو۔ مجھے پتا ہوتا کہ تم لاچار ی میں اکیلے بڑے ہو تو صبح ہی آجاتی کھانے کا پوچھنے۔ میں روٹی اس لیے نہیں ساتھ لانا۔ تمہی کہ گھر میں ضرور پکی ہوگی۔ اب تم آرام سے بیٹھ کر کھانا شروع کرو میں ایک منٹ میں پکا کر لاتی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ وہ انہیں روکتا۔ امی عجلت میں اٹھ کر باہر چل دیں۔ ان کی منٹانے ایسا جوش مارا تھا کہ پلٹ کر رائے کو دیکھنے کا بھی خیال نہ آیا۔ وہ جزیب سی کر سی۔ بیٹھی حیران پریشان انہیں جا۔ تہ دیکھنے لگی۔ آیا وہ بھی اٹھ کر پیچھے جائے یا یہاں رک کر ان کا انتظار کرے۔ اسی تذبذب میں وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

”آپ کی امی بہت جذباتی ہیں۔“ وہ جو انہیں روکنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ اب شکایتی انداز

میں بیٹی سے مخاطب ہو کر جھلاہٹ دوہ کر رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔ اس کے نادر خیال کے جواب میں کیا کہی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا۔ اپنے اطراف سے ہوشیار رہیے گا۔“ اس کے لہجے کی جارحیت اور ناراضگی رائے کو چونکا گئی۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟“

”آپ کے گرد نقابوں والے لوگ پھرتے ہیں۔ ہوشیاری نہ دکھائی تو ان کے چال میں پھنس جائیں گی۔“ اس کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔ کمال ہے اسے میری جاب یا سلامتی سے کیا مطلب۔

”مجھے دوست دشمن کی پہچان ہے۔“ وہ برامان ہو گئی۔

”سی لے تو کہتا ہوں کہ خواستہ تمہیں مار خان بنتی ہیں۔ دور کا دشمن دیکھ لیتی ہیں۔ مگر سامنے والے کو نہیں پہچان سکتیں۔ وار کرنے والا بسا اوقات عین آنکھوں کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ مگر اسے شناخت کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے سیدھا سیدھا احمق قرار دے رہا ہے۔

”آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”مرضی ہے آپ کی۔ پچھتاتے سے پہلے کی تکلیف برداشت کر لیتا زیادہ بہتر ہوتا ہے بعد میں سر پکڑ کر رونے سے۔ لیکن آپ کو شوق ہے ذاتی تجربے کا بہر حال میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس نے رکھائی سے کندھے اچکا دیے۔ اسی دوران امی گرم گرم روٹی چنگیر میں رکھے واپس آگئی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس واقعے کو چند دن گزر چکے تھے۔ اس کا باؤں تیسرے دن ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ رائے نے بھی شکر کی سانس لی۔ ورنہ امی نے جو تیار داری کا شیڈول بنا لیا تھا۔ اس کی وجہ سے گھر پور وٹمن خاصی متاثر ہوئی تھی۔ صبح کا ناشتہ دوپہر اور پھر رات کا کھانا۔ رائے اس روز

کے بعد دوبارہ امی کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ یوں بھی ایک چھترے چھانٹ مرو کے پاس جانے کا جواز بھی نہیں بنتا تھا۔ امی تو خیر اپنی اخلاقیات اور متا سے مجبور تھیں سو اس کے اچھی طرح ٹھیک ہو جانے تک باقاعدگی سے خبر گیری کرتی رہیں بعد میں وہ بھی دوبارہ نہ گئیں۔ یوں بھی وہ موصوف صبح کے نکلے شام گئے گھر لوٹتے تھے۔

رائے کو آج ایف ایون جانا تھا۔ پرسوں اسے پہلی تنخواہ ملی تھی اور شانے تنخواہ دیتے ہوئے اسے ڈیوٹی ایریا بتایا تھا۔

”تقریباً“ ایک بجے کے قریب جانا۔ اس سے پہلے تو یہاں کی بینکات کی ویسے بھی آنکھ نہیں کھلتی ہوگی۔“ نہ جانے کیوں رائے اس کام سے مطمئن نہیں تھی۔ ایک ماہ سے زائد ہو گیا تھا مگر وہ ابھی تک خود کو کمپنی ورکرز اور ماحول کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر پائی تھی۔ اسے اپنا آپ اجنبی سا لگتا۔ یوں جیسے وہ کسی غلط جگہ پر آگئی ہے۔ ان لوگوں کے درمیان ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کام کر رہی ہے جو اس جیسی لڑکی پر سوٹ نہیں کرتا۔

سفید بڑے سے گھر کی نیل بجاتے ہوئے وہ خاصی الجھی ہوئی تھی۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا اور کمپنی کا تعارف کرانے کے بعد بیگم صاحبہ کو اطلاع دینے کو کہا۔

”آپ اندر آجائیے۔“ ملازم نے واپس آکر مودبانہ کہا۔

”ایک تو محترموں کو یہاں تک چلتے ہوئے موت آتی ہے۔“ وہ تھکاتے ہوئے اندر آگئی۔ ملازم اپنی رہنمائی میں اسے ایک برشکوہ کمرے میں چھوڑ کر دروازہ بند کر کے باہر چلا گیا۔ اسی لمحے دوبارہ دروازہ کھلا۔

”وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔“ جانی پہچانی شانت آواز پر اس نے گردن گھمائی اور پھر جیسے پوری ہمت اس پر آری۔

سیاہ عمری پس سوٹ میں فرمان بڑی نشلی مسکن سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ! یہ آپ کا گھر ہے؟“ اس کے سوکھے ملن سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”جی ہاں! یہ میرا غریب خانہ ہے۔ صد شکر کہ آپ نے روٹی تو بخشی۔ میں کب سے آپ کا منتظر تھا۔“ اس کی آنکھوں اور لہجے سے آج پھوٹی محسوس ہو رہی تھی۔ رائے غیر محسوس انداز میں چند قدم پیچھے سرک گئی۔

”دو نہیں بے لی کم آن!“ اس کا مخمور اور سرگوشیانہ ہو گیا۔ وہ اتنا نزدیک آگیا تھا کہ بچے نکلنے کا راستہ نہ رہا تھا۔ رائے کی خوف سے اہلٹی آنکھیں مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ذرا اپنا ہاتھ دیں مجھے۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔

اسی لمحے رائے کے ذہن میں آگیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ سائڈ نیبل پر رکھا ہینٹل کا بڑا سا گلدان اٹھانے میں محض ایک سیکنڈ ہی صرف ہوا تھا۔ اگلے منٹ میں وہ پوری قوت سے فرمان کی پیشانی پر لگا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ ڈکراتے ہوئے جانور کی طرح قالین پر لڑھک گیا۔ اس کی پیشانی چہرہ اور گردن خون سے رنگین ہو چکے تھے۔

رائے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلدان دوبارہ اپنی جگہ پر رکھا اور خود کو ٹھینتے ہوئے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ بدحواسی میں وہ اپنا بیگ بھی وہیں چھوڑ آئی تھی۔ گیٹ پر موجود جو کیدار نے حیرانی سے اسے تقریباً بھاگتے ہوئے نکلے دیکھا تھا جتنی دیر میں وہ صورت حال سمجھ کر اس کے پیچھے آتا وہ مارکیٹ والی روڈ پر ٹرن لے چکی تھی۔

”اللہ میاں کوئی ٹیکسی مل جائے۔“ وہ جلد از جلد اس سیکڑے دور ہونا چاہتی تھی۔

معا” ہونڈا سی ڈی سیوٹی پوری رفتار سے اس کے قریب آکر رکی۔

”چلو بیٹھو۔“ اس کا لہجہ کھردرا اور مضطرب تھا۔ رائے نے فیصلہ کرنے میں ایک سیکنڈ کی بھی مہلت نہ لی اور جیسے تیسے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ گو کہ یہ بھی رسک ہی تھا۔ وہ شخص بھی اجنبی تھا اور اس کے

خلاف خاصے جارحانہ تیور رکھتا تھا۔ مگر جان و آبرو بچانے کے لیے اس نے نسبتاً کم خطرناک راستے کا انتخاب کر لیا۔ اگر ٹیکسی کے انتظار میں گھڑی رہتی تو فرمان کے بندوں کے ہاتھ لگنا مشکل نہیں تھا۔

خدا جانے وہ مردود مر گیا ہے یا؟ اور اگر بچ گئے وہ ہلاک ہو گیا تو؟ اسے سوچ کر ہی جھر جھری آگئی۔ مجھے کیا خبر تھی اس ایریا میں اس کی رہائش گاہ ہوگی۔ جلد ہی وہ لوگ پشاور موڑ بیچ گئے۔ مارکیٹ کے قریب کابل ریسٹورنٹ کے آگے اس نے بائیک روک دی۔

”چلو آؤ۔“

”مم۔ میں نہیں اتروں گی۔ مجھے اپنے ہنس جانا ہے۔“

”مجھے بھی غیر عورتوں کو ساتھ لے کر ہوٹلوں میں خوار ہونے کا شوق نہیں ہے کچھ بات کرنا ہے تم سے“ اب کیا چوراہے پر کھڑا ہو جاؤں تمہارے ساتھ؟“ وہ برس پڑا۔ رائے گڑبڑا کر اس کے ہمراہ اندر آگئی۔ دل ہی دل میں جل بھن رہی تھی۔ بھلا میں کیوں خواجخواہ موصوف کے رعب میں آ رہی ہوں بڑا آیا میرا چاچا ماما اسے اپنی بے بس کیفیت بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”کچھ بچالائی ہو یا گنوا آئی ہو اپنا آپ؟“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑی چھتی نظروں سے اسے ٹٹل رہا تھا۔ رائے کی ہتھیلیوں میں پینے اتر آیا۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے سرستہ کرائگیاں مسل رہی تھی۔ چہرہ احساس شرمندگی سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ بہت طاقت لگا کر اس نے مضبوط اور ٹھوس لبو لہجہ اختیار کیا تھا۔

”نورا واقعہ بیان کرو۔“ اس کے چہرے سے سکون اور اطمینان جھلکنے لگا۔ رائے نے مختصراً بتا دیا کہ موصوف کی جسارت پر اس نے کیا حکمت عملی اپنائی۔

”اس سے پہلے کہاں ملا تھا تم سے؟“ وہ کس دھڑلے سے اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ رائے کو طیش تو آیا۔ مگر صبر کے گھونٹ بھر کر چپ رہی۔

”جس دن میری کمرشل ایریا میں ڈیوٹی تھی۔ اس

کے تیور مجھے اسی دن کھٹک گئے تھے اس لیے اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آنے کے بجائے جان چھڑا کر آ گئی تھی۔“

”تمہیں سازش سے پھنسا یا گیا ہے۔ مگر کمال حماقت یہ ہے کہ تم ابھی تک سامنے کا بندہ نہیں دیکھ سکیں!“

”کون لیاقت صاحب؟“ اسے خیال آیا۔

”نہیں وہ محض کاغذ کے شیر ہیں۔ پس پرہ دوسرے لوگ ہیں۔“ اس نے ذہنیت سے کام لیا۔

”دوسرے کون۔“ رائے الجھ گئی پھر چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”مگر آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا اور آپ ایف ایون کس طرح پہنچے۔“ سب سے پہلے پوچھے جانے والے سوال کا خیال اسے اب آیا تھا۔

”آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں تو آپ کو دوسرے بھی نظر آئیں ناں۔“ وہ طنزاً بولا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

اور پھر جب اس نے آفس کے عین سامنے پارکنگ لائٹ میں موٹر بائیک روکی تو اپنی گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی شانے انتظار رہے کے تحیر سے ان کی سمت دیکھا تھا۔ وہ اسے ڈراپ کر کے فوراً واپس ہو لیا۔

”یہ تمہیں کہاں مل گیا اور اس نے تمہیں اپنے ساتھ بٹھانا کیسے گوارا کر لیا۔“

شانے کے لہجے سے استعجاب ٹپک رہا تھا۔ رائے کوئی بات نہ بنا پائی کیا بتائے اور کیا کہے۔ اس نے شانے کے تعجب پر دھیان نہیں دیا تھا وہ اس ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ شا کو سارا واقعہ بتانا چاہیے یا نہیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

دوسرے دن اس کی آف تھی۔ اس سے اگلے روز ڈیوٹی پر آئی تو اندر سے خوفزدہ سی تھی۔ کسی انہونی کے ڈر سے ادھ موٹی ہوئی جا رہی تھی۔

”رائے ادھر آؤ۔“ شانے کے پکارنے پر وہ متوحش سی اس کی نیبل کے پاس آکر رکی۔

”تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا پرسوں؟“ اس کا لہجہ

بے حد نرم تھا مگر نظریں گہرائی تک جانچنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

”سوں؟“ اس کا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔
”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے جلدی سے تھوک نگل کر کہا۔

”مگر فرمان صاحب کے ملازمین کا خیال کچھ اور ہے۔ ان کے مطابق تم نے کمپنی کے براؤٹ متعارف کروانے کے بہانے گھر میں گھس کر فرمان صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا اور پھر انہیں زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو گئیں۔ گیٹ کا چوکیدار اور مالی گواہ ہیں اس واقعے کے۔ انہوں نے تمہیں آتے جاتے دیکھا تھا۔“

رائنہ کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔
”یہ۔ یہ الزام ہے مس ثناء! اصل واقعہ کچھ اور ہے۔“

”میں وہی پوچھ رہی تھی۔“ ثناء کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ رائنہ نے ہانپتے کانپتے سارا احوال کہہ سنایا۔
”لیکن تمہاری بات کی سچائی پر کون یقین کرے گا۔ وہ فرمان صاحب تو تمہارے خلاف پرچہ کنوائے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ ثناء کا چہرہ گہیر ہو گیا۔

”کیا؟“ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ لاکھ بہادر اور بولڈ بھی تو لڑی۔ جسے غم روزگار کے ہاتھوں پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ اپنی زمانہ شناس بہر حال نہ ہوئی تھی کہ شاطرانہ چالوں کو سمجھ سکتی۔

”تم چاہو تو ان سے مل کر معذرت کر کے معاملہ سنبھال سکتی ہو۔“ ثناء گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”وہ بہت غصے میں ہیں مگر تمہاری معذرت سے ہو سکتا ہے مان جائیں۔ مرد کو پٹانا کون سا مشکل ہوتا ہے۔“

”آئی ایم سوری میں ان کی خوشنودی کے لیے یہ سب نہیں کر سکتی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔
”سوچ لو، معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ وہ گھڑی کی چابلی اور خوشامد عمر بھر کی بدنامی سے بہر حال کم

تکلیف دہ ہے۔“ اس نے جیسے نتائج سے ڈرایا۔
رائنہ مجھے میں پڑ گئی۔ نہ جائے رقت نہ پائے ماندن۔

”میں دوبارہ اس مکار بھٹریے کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ وہ بے بسی سے گویا ہوئی۔

”تمہارا رویہ کمپنی کے سودے پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ فرمان صاحب نے ہم سے ایک اہم ذیل کی ہے۔ تمہارے انکار کی صورت میں وہ کینسل ہو سکتی ہے۔“ ثناء بے نیازی سے کانڈات پر جھک گئی تھی۔

”کچھ بھی ہو، میں دوبارہ اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ وہ دل ہی دل میں تہہ کر چکی تھی۔ ”اب تو قسمت سے بچ نکلے گی دوبارہ گئی تو شاید کبھی واپس نہ آ سکوں۔ اس سے تو بہتر ہے۔ میں ملازمت چھوڑ دوں پھر اس نے فیصلہ سادیا۔

”ہماری کمپنی کا اصول ہے کہ جاب چھوڑنے سے پندرہ روز پہلے نوٹس دینا ہوتا ہے۔ تاکہ ہم بروقت متبادل کا انتظام کر سکیں۔“ جونہی اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ آگے سے ثناء کا کھڑا توڑ جواب اسے برف بنا گیا۔ گویا اب مزید پندرہ روز تک ڈیوٹی پر آنا تھا۔ تب ہی نجات مل سکتی تھی۔

”میں آج ہی نوٹس دے دیتی ہوں۔“

”تم نے اپنی حماقت سے فرمان صاحب سے بگاڑ پیدا کیا ہے۔ کمپنی کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اب یا تو نتائج بھگتو یا پھر فرمان صاحب سے مل کر معاملے کو یہیں ختم کروادو، مرضی ہے تمہاری۔“ ثناء کے اس طرح غیر جانبدار بن جانے پر اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے لفظی ہمدردی بھی نہیں جتائی تھی۔ اسے اس وقت ماں کی مہربان آغوش کی طلب بری طرح ستا رہی تھی۔

ثناء انٹرکام پر سر کی ہدایت سن رہی تھی۔

”طاہرہ اسفندیار صاحب سے کہو، سر اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔“ اس نے فون رکھ کر ریک جھاڑ لی

طاہرہ کو آواز لگائی۔
رائنہ مرے مرے قدموں سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ مانع سوچوں کی آواز نہ ہونے پر تھک جاتی

کے شریک راز کردوں۔

اسی ٹافے ایک صاحب چیز تیز قدموں سے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ رائنہ نے یونہی اپنی سیٹ پر نگاہ ڈالی یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر یہ اسفندیار صاحب کیا چیز ہیں جس کے اتنے چرچے ہیں۔

چوڑے شانے، لمبا قد، گندمی رنگت، گھڑی ٹاک، ڈار سا سپاٹ موڈ اور وہ مائی گاڑ میں کتنی نادان ہوں۔ سامنے کی بات نہ جان پائی، اسے اپنی حماقت پر جی بھر کر افسوس ہوا۔

وہ اپنی ڈیوٹی پر جاتا تھا اور وہ سمجھتی رہی تھی کہ اس کا بیچھا کر رہا ہے۔

اسی لیے تو وہ کمپنی کے لوگوں کو جانتا تھا۔ کمپنی کے مرکزی گیٹ سے کچھ آگے جا کر اس کا بائیک بلڈنگ کے عقبی گیٹ کی طرف مڑ جاتا تھا۔ وہ چونکہ بروڈکشن کے شعبے میں تھا اس لیے براہ راست سامنے کا اتفاق ہونا مشکل ہی تھا۔ دیوار کے اس پار کا منظر آج واضح ہوا تھا۔

تو یہ تھا اسفندیار مگر اس کی وہ برسرِ باتیں، تنبیہیں، انداز، ڈانٹ ڈھٹ بلکہ جھڑکیاں۔ وہ کس مقصد کے تحت اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کے مفادات کا خیال رکھ رہا تھا۔ ایک گھر کھلی تو وہ سری پڑ گئی۔

وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر یاس کے کمرے میں داخل ہو کر اٹھا۔

”ایک منٹ اسفند۔“ پندرہ منٹ بعد وہ باہر آیا تو کاؤنٹر پر موجود ثناء نے مخاطب کیا۔

”یہ کچھ پیپر ہیں۔ ان کے حسابات کچھ گڑبڑ ہیں۔ تم چیک کرو ذرا۔“ صاف لگ رہا تھا کہ محض روکنے کا بہانہ ہے۔

”کسی ملازم کے ہاتھ میرے کمرے میں بھجوا دیں۔ میں دیکھ لوں گا۔“

وہ رکے بغیر آگے نکل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہال سے باہر تھا۔ احساس تو ہیں سے وہ ایک دم سرخ ہو گئی۔ شاید ایک وجہ رائنہ کی موجودگی بھی تھی۔
”اب ایسی بھی کیا بے مولیٰ۔ بندے کو کچھ تو

خیال رکھنا چاہیے مینوز۔“ رائنہ نے بد مزگی سے سوچا تھا۔ اس کی ہمدردیاں ثناء کے ساتھ تھیں۔

♡ ♡ ♡

”تی، اہم بات تم آج بتا رہی ہو مجھے۔“
ایسی سنتے ہی دل تھام کر رہ گئی تھیں۔ انہیں اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ رائنہ نے شروع دن سے ہی سارے معاملے سے باخبر کیوں نہ کیا۔ اب پائی سرے گزر چکا تھا۔ ایکلی عورتیں سر پر کوئی چھت نہیں۔ معاشی و معاشرتی پوزیشن انتہائی کمزور ہے۔ ایسی صورت میں ایک بارسوخ اور طاقتور شخص کی دشمنی کسی بھی خطرناک نتیجے سے دوچار کر سکتی تھی۔ وہ بے حد پریشان ہو گئیں۔

”مجھے تو اوّل روز سے کھٹک رہی تھی یہ تو کری۔“ اخباروں میں پرکشش اشتہارات شائع کرنا اگر نوجوان لڑکے لڑکیوں کو راتوں رات امیر بننے کے خواب دکھاتے ہیں اور پھر ان کی سادگی، ناواقفیت سے کھلتے ہیں۔ اگر اس طرح سیکڑی کے بل پر کوئی کار تک پہنچا جاسکتا تو آج کوئی مفلس اور فلاں نہ بھرتا اور پھر عزت و ایمان اور شرم و حیا کا سودا کر کے کچھ کمایا بھی تو کیا حاصل۔ ایسی کمائی سے تو بھوکا مرنا بہتر ہے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تمہیں ایسی جاب کی اجازت ہی نہیں دینی چاہیے تھی۔“ وہ کف افسوس مل رہی تھیں۔

”اس وقت صورت حال بھی تو ایسی تھی اور کوئی جاب جو نہیں مل رہی تھی۔“ اس نے افسردگی سے منہ ڈکا لیا۔

”اب کیا ہو گا امی! میں جاب چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ کم از کم پندرہ دن لازمی جانا ہو گا۔ ورنہ کمپنی قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر میرے خلاف کیس کر سکتی ہے۔“ وہ ماں کے بازو سے لگ کر پوچھ رہی تھی۔

”میں اسفند بیٹے سے بات کر گئی ہوں۔ شاید وہ کوئی حل نکالے۔“

”لا حول ولا قوۃ۔ اب کیا اپنے گھر کی بات غیروں سے ڈمکس کرتے پھر گئے؟“ وہ فوراً چراغ بپا ہو گئی اور پھر ان جیسے آدم بیزار اور لوہے کے دل والے

بندے کو ہم سے کیا سوکار۔ کیوں خواہ مخواہ انکار سن کر جی خراب کرنا چاہتی ہیں۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بات چیت میں روکھا پھیکا سہی دل کا بہت اچھا ہے۔ کتنا خیال رکھتا ہے میرا۔ جب تم نہیں ہوتی تو اکثر آتے جاتے تیل بجا کر دروازے پر کھڑے کھڑے میرا حال پوچھتا ہے۔ تاکید کرتا ہے کہ کوئی کام ہو تو ضرور بتائیے گا۔ پھر وہ ذمہ دار طبیعت کا سلجھا ہوا نوجوان ہے۔“

”نوجوان کتنا تو خیر صاف تہمت ہے ان پر۔ موصوف اپنے منہ سے اقرار کر چکے ہیں کہ میں برس کے ہو چکے ہیں۔“

”میں جاری ہوں اس کے پاس۔“ امی نے گھور کر اسے دیکھا۔

”تم نادان ہو۔ معاملے کی تہہ تک نہیں جھانک سکتیں۔ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔ بڑی نازک صورت حال ہے اور اگر فوری قدم نہ اٹھایا گیا تو خدا نخواستہ عمر بھر کی پوچھی لٹنے کا احتمال ہے۔ دروازہ بند کر لو تم۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے امی؟“ ان کی تجویز سن کر اس نے طویل چیخ ماری تھی۔ ”آپ موصوف کے پاس مسئلہ حل کرانے گئی تھیں یا میرا رشتہ طے کرنے؟“ وہ ٹھپاں پیچ کر اپنا غصہ کنٹرول کر رہی تھی۔

”تم سنو تو سہی ہتھ سے کیوں اکھڑ رہی ہو ادھر آؤ یہاں بیٹھو میں تمہیں ساری بات بتاتی ہوں۔“ انہوں نے زبردستی اسے اپنے بستر پر بٹھالیا پھر ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بتانے لگیں۔

”میں نے اپنی بات بتائی تو اس نے بتایا کہ وہ کافی حد تک معاملے سے واقف ہے وہ اسی کمپنی میں کام کرتا ہے۔ یہ بات بھی اس کے علم میں تھی کہ فرمان اینڈ سنز کے ساتھ تمہارے پاس کی کوئی اہم ذیل ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خفیہ ذیل بھی مشروط کی گئی تھی۔ چنانچہ پاس کے مشورہ طلب کرنے اور فرمان کے فون کرنے پر نشانے تمہیں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت فرمان کے علاقے میں مارکیٹنگ کے لیے بھیجا۔

کسی طرح اسفند کو اس پلان کا علم ہو گیا تھا اسی لیے اس دن تمہاری تلاش میں ایف ایون کی طرف آیا تھا۔ اسفند کو یقین ہے کہ فرمان کی طرف سے زبردستی گھر میں گھس کر قاتلانہ حملہ کرنے کا کیس بھی شاید پاس کے مشورے سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تمہاری بیک پر کوئی نہیں ہے اس لیے ذرا دھمکا کر تمہیں اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی کے پیش نظر اسفند نے تمہاری شادی کی تجویز پیش کی تھی۔ میں نے عذر پیش کیا کہ فی الحال اتنی جلدی رشتہ نہیں طے کیا جاسکتا۔“

”اور جواب میں موصوف نے اپنا پروڈنل پیش کر دیا۔“ رائے نے دانت پس کر بات مکمل کی۔

”تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ امی اس کے غیض و غضب پر جل کر پوچھنے لگیں۔

”اسے کہتے ہیں جان نہ پہچان اور بڑی خالہ سلام۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اس سے ٹاکرا ہوئے اور ہم بلا سوچے بچے رشتہ داری توڑنے لگیں؟ حد ہو گئی امی! صرف ایک ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں کسی کو کیسے پرکھا جاسکتا ہے۔ خدا جانے وہ سچا ہے یا فراڈ کر رہا ہے۔ یونہی جھوٹی موٹی داستان سنا دی ہو اپنی بیٹی کی۔“ وہ جلال کے عالم میں کمرے میں ٹھل رہی تھی۔

”میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ تم ابھی کم عمر ہو۔ بچی ہو اپنا برا بھلا ماں سے زیادہ نہیں جان سکتیں۔ دنیا بے اعتبار سہی مگر آخر کسی پہ تو بھروسہ کرنا ہے۔ اس کے بغیر گزارا بھی نہیں ہے۔“

”مگر میں موصوف سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آئی ایم سوری۔“ اس کے صاف جواب پر امی چیپ رہ گئیں۔

”ٹھیک ہے۔ میں اسے جواب دے دیتی ہوں۔ تم زبردستی تو نہیں کر سکتی اب۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”سنو رائے! تم کسی اچھے وکیل کو جانتی ہو؟“ اس کے ڈیوٹی بھگتانے کی مدت میں ٹھن پانچ دن

باقی رہ گئے تھے۔ جب شانے ایک روز اچانک پوچھ لیا۔

”کیوں؟“ وہ ڈر سی گئی تھی۔

”مگر جانتی ہو تو اس کا بندوبست کر لو۔ ابھی تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے پولیس کے دو ایملکار آئے تھے ساتھ لباس۔ میں انہیں تمہاری تلاش ہے۔“

”کیا مطلب۔“ اس کے دماغ پر جیسے کسی نے ہتھوڑا برسایا تھا۔

”ہاں، فرمان صاحب تم پر کیس کر چکے ہیں۔ میڈیکل رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ان پر پیتل کے بھاری بھرکم آلے سے وار کیا گیا اور پولیس گلڈ ان پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی لے چکی ہے۔“

شان کا لہجہ جتنا لاہور تھا اسی حساب سے رائے کے اندر خوف سرایت کرنا جا رہا تھا۔

وہ جیسے تیسے کام پینا کر شام کو گھر پہنچی تو ایک نئی قیامت اس کی کٹھنر تھی۔

”رینو بی! ہم تو تباہ ہو گئے۔ آج وہ سہر کو پولیس آئی تھی یہاں تو اچھی طرح گھر کی تلاشی لے کر گئی ہے۔ وہ تو شکر ہوا جو دونوں یونیفارم میں نہیں تھے ورنہ سارا محلہ تماشا دیکھتا۔“ امی کی آواز کانپ رہی تھی۔ چوہ ہلدی کی طرح زور ہو رہا تھا۔

”اب اور بربادی کیا ہوگی۔ بس میں نے ٹھان لیا ہے۔ تمہیں میری قسم۔ اب تم کچھ نہیں بولوگی۔ میں آج ہی اسفند سے بات کرتی ہوں۔ کل تک تمہارا نکاح ہو جانا چاہیے۔ الیاس اس کی بیوی کو اور ثریا کو مدعو کر لیتے ہیں۔ بلڈ ٹک کے باقی لوگوں کے گھر مٹھائی بھجوا دیں گے تاکہ اطلاع بھی ہو جائے اور ان کا گلہ بھی جا مارے کہ شادی میں نہیں بلوایا۔“

”امی پلیز! ایسا کچھ نہ کریں۔ دیکھیں میری بات سنیں۔“ اس نے انہیں روکنے کی بہتری کو شش کی مگر وہ اپنے ارادے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹیں۔

”اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔ پہلے بھی تمہاری مان کر سلیز ایگزیکٹو کی جاب پر رضامندی ظاہر

کی تھی۔ اب بھگت لیا ہے اس کا نتیجہ۔“ وہ بے بسی سے سر ہنجی رہ گئی۔ ٹرانسوں نے اپنی سی کر ڈالی۔

اگلے دن وہ وہ سہر کو چھٹی لے کر گھر واپس آئی تھی کہ امی نے سختی سے ہدایت کی تھی۔ شام تک نکاح ہو گیا۔ بے حد سادگی بلکہ افرا تفری میں ہوا تھا۔ دنہائے کاروائی اہتمام بھی نہ ہو سکا۔

اتفاق سے امی نے عید کے لیے اس کا فیوزی ہلکے سے دیکھ کے کام والا سوٹ بنوا کے رکھا تھا۔ وہی پہنا دیا گیا۔ زیور کے دو سیٹ امی نے شروع سے اس کے لیے سنبھال رکھے تھے۔ انہیں پہن لیا۔ مندی امین کا بھی وقت نہیں تھا۔ بس ہلکی سی لپ اسٹک اور کاجل کی دھار آرائش کا کام دے رہی تھی۔

”انشاء اللہ دیکھو پ کس نکالیں گے۔“ امی مطمئن تھیں۔

”امی! آپ ایسا ہی نہ جانتی گی۔“ اسے یاد اس رعدی اور امی نے اس کی دعا آرا تھا۔

”امی! کیاں پتہ ہے کہ وہ قدم کا لٹا سکتا ہے۔“ انہوں نے بڑے حوصلے سے کام لیا تھا۔ خود تمام اسفند کے کمرے میں بھول کے آئی تھیں۔

”رو کیوں رہتی ہو؟“ کمرے میں آتے ہی موصوف نے پہلا سوال داغ تھا۔

”موجی اب روؤں بھی نہ اپنے برے نصیبوں پر اور پوچھ کیسے رہے ہیں۔ جیسے ڈانٹ رہے ہوں اب آ رہا ہے روٹا تو ہم کیا کریں۔“ اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔

وہ بیڈ کے بجائے نیچے قالین پر بیٹھی تھی۔ سرالبتہ مسری سے نکالیا ہوا تھا۔

اسفند یار اطمینان سے اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہا تھا۔ پھر الماری کھول کر کپڑے نکالے اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔ واپس آیا تو کمرے آرام و شلوار قمیص میں تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی تھی البتہ زیور آتے ہی اتار کر ڈرنگ نیمبل کی دراز میں ڈال دیا تھا بلکہ نشو سے لپ اسٹک بھی رگڑ کر اتار دی تھی۔ کپڑے اس

لے نہیں بدلے کہ خامے آرام دتھے اور اس کے پاس دوسرے تھے بھی نہیں۔

”کیا مسئلہ ہے۔ لڑائی وغیرہ کاموڑ ہے کیا۔“ وہ اس کی طرف آتے ہوئے بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور ہولے سے اس کے بندے کے سر کے بالوں کو چھوا۔ وہ سرک کر آگے ہو گئی۔ ادیبہ کی خوشبو نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کے تاثرات پر بڑھ رہا تھا۔ رائے کے رد عمل نے اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر دی تھی۔ وہ اس کی موجودہ حیثیت قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

”آئی نے بتایا تھا کہ تم مجھ سے شادی پر رضامند نہیں ہو مگر یہ سرجال ان کی مجبوری تھی اور۔“

”کیا مجبوری تھی؟“ اس نے پھر اے ہوئے لیے

میں بات کالی۔ اور اگر تھی بھی تو بھی تو اس حکمت عملی سے کیا فائدہ ہوا۔“

”وہ تم خود دیکھ لو گی عنقریب۔“ اس کے لیے میں استحکام تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر دراز ہو گیا تھا۔

”اور آپ نے ہماری مجبوری کا سودا کیا ہے۔“

اسے رتی برابر اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلکہ گھرا ہوا گیا۔

”نادان ہی نہیں کم نظر بھی ہو۔“ اس نے افسوس ظاہر کیا۔

”سرجال تم اپنے چھوٹے سے دل پر زور نہ ڈالو۔ چلو سو جاؤ پھر بات ہوگی۔“ وہ اچانک ہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ اگلی صبح اسے پتا چلا موصوف ڈرائنگ روم میں سوئے تھے۔ رائے کو سرے سے غینہ آئی ہی نہیں تھی۔ بار بار دل بھر آتا رہا۔

صبح کما تھا شام نے۔ پتھر ہے بالکل پتھر اتار ف۔ اس نے بسور کر سوجا تھا۔ اس ساٹ دو وار جیسے مشینی بندے کے ساتھ زندگی کتنی پور کر رہی تھی۔

ناشتہ امی بڑے چاؤ سے بنا کر لائی تھیں۔ انہوں نے بیٹی اور داماد کو خوب خوب پیار کیا تھا مگر رائے کاموڑ درست نہ ہوا۔ اسے دونوں پر وہ نہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ناشتہ کے بعد وہ طوعاً و کرہاً اسفندیار کے ساتھ آفس جانے کے لیے نیچے آئی تو اس کی ہونڈا کی جگہ

نئی سوزوکی کار کھڑی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر یاد آیا وہ گزشتہ ایک ہفتے سے اس کار کو یہاں دیکھ رہی تھی۔ گویا موصوف موٹر سائیکل بیچ کر کار خرید چکے ہیں۔ وہ سوچتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ادیبہ کی خوشبو نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر اس کے اتنا قریب جو بیٹھی تھی۔

خاصی رنگ میں تھے صاحب اور تو اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے کچھ لگتا بھی رہے تھے۔

”لوہ نہ میرا دل جلانے کے حربے ہیں۔“ وہ تپ کر رہ گئی تھی۔

اسے اس کے ساتھ آتے بہت سارے لوگوں نے دیکھا تھا حتیٰ کہ شائے بھی مگر اسفندیار کو جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ بلکہ اسے ہال کمرے میں خود پینچا کر گیا تھا۔

”میرے کمرے کا فون نمبر ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو فوراً رنگ کر دینا میں شام کو نہیں یک کر لوں گا۔“

اس کے بعد وہ چابی جھلتا تا باہر نکل گیا تھا۔ ناشتہ سرد کی دیکھتی رہ گئی۔

کچن کی طرح دو روز بیت ہی گئے۔ اگلے دن اسے اسٹیفنی آدے کریش کے لیے یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ وہ اس آخری صبح کپنی کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے مکمل طور پر مطمئن تھی مگر اس سے پہلے کہ شا کو اپنا اسٹیفنی دینا وہاں ساتھ لباس میں پولیس کے دو اہلکار اس کے منتظر بیٹھے تھے۔

”ہم آپ کو پوچھ کچھ کی غرض سے تھانے لے جانے آئے ہیں مگر!“ رائے کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔

”ہم۔ مگر کس سلسلے میں۔“ اس کی رنگت پہلی پڑ گئی۔ اس نے امداد طلب نظروں سے شا کی طرف دیکھا اس نے کندھے اچکاتے ہوئے فائل میں سر دے لیا۔

”ایک منٹ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں کسی قسم کی کارروائی سے باز رکھنے کی تلقین کی اور پھر کا پتے ہوئے اسفندیار کے کمرے کے نمبر ڈائل کیے۔

”اسفندیار! آپ ہال میں آجائیے۔“ اس نے اتنا کہ

کرفون رکھ دیا۔

”اسفندیار تمہارا کیا لگتا ہے جسے مد کے لیے پکار رہی ہو۔“

”میں معنی خیز انداز میں مسکرائی۔“

”اس کا جواب وہ خود دیں گے۔“ رائے نے سپاٹ لہجے میں کہا اور شا کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ سیدھا اس کی فیل کے پاس آیا تھا جہاں وہ ساتھ لباس والے کھڑے تھے۔

”جی کیا مسئلہ ہے؟“ اس کا انداز دو ٹوک اور قطعی تھا۔

”ہم انہیں ایک کیس کے سلسلے میں اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جانے آئے ہیں؟“ ایک سپاہی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”پولیس اسٹیشن یا فرمان صاحب کے بیگلے میں۔“

اس کا چہرہ ہوا درشت لب و لہجہ اہلکاروں کے ساتھ ساتھ شا کو بھی چونکا گیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ دونوں اہلکاروں کے چہرے گھبراہٹ سے تر ہو گئے۔

”مطلب بھی سمجھا دیں گے۔ کیا آپ مجھے اپنے کاغذات دکھانا پسند کریں گے؟“ اس کا لہجہ پرسکون تھا۔

”کیسے کاغذات؟“ ایک نے اکھڑے ہوئے انداز میں رعب جمانے کی کوشش کی مگر اس کا چہرہ بے اعتمادی کا اشتہار بنا ہوا تھا۔

”جس کی بنا پر آپ کو پولیس اہلکار سمجھا جاسکے۔“

اسفندیار انتہا درجے کے سیلف کنٹرول سے کام لے رہا تھا۔

”تو کیا آپ کے خیال میں ہم جعلی پولیس والے ہیں۔“ ایک نے تڑی لگائی۔

”صرف خیال ہی نہیں مجھے یقین بھی ہے۔ البتہ آپ کی یقین دہانی کے لیے میں جیسٹریٹ نیاز فاروقی سے یہاں آنے کی درخواست کر سکتا ہوں۔ میں سارا معاملہ ان کے گوش گزار کر چکا ہوں کہ وہ جعلی پولیس والے ایک شریف لڑکی اور اس کے گھروالوں کو اپنے پاس فرمان صاحب کی ہدایت پر تنگ کر رہے ہیں اور ڈرا دھمکا کر اسے اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رہا

کاغذات جملے کا کیس تو اپنے پاس سے کتنا بہت ہے تو“

”جی جی پرچہ درج کروادیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عدالت میں کیس چلے گا تو الٹا ان کی گردن پھینے گی۔ لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے جرم میں عدالت انہیں سزا سناسکتی ہے۔ ایسے کیسز میں چونکہ خاتون کو اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے جوابی اقدام کرنے پر سزا نہیں ہوتی اس لیے وہ صاف بیچ جائے گی۔ میں فرمان صاحب سے برتاو کیل کر سکتا ہوں۔“

وہ بہت برا اعتماد بے خطر اور بارعب لگ رہا تھا۔ وہ درحقیقت ان کرائے کے غنڈوں سے زیادہ شا کو سنا رہا تھا۔ جانتا تھا اس کے ذریعے یہاں کی کارروائی حرف بحرف فرمان صاحب تک پہنچ جائے گی۔

”مگر آپ اس خاتون کے کیا لگتے ہیں۔“ ایک جعلی پولیس نے پوچھا۔ اس کے غبارے سے ہوا اٹکل چکی تھی۔ اب وہ شرافت سے سر جھکائے کھڑے تھے۔

”میں اس کا شوہر ہوں۔ کیا نکاح نامہ دکھاؤں۔“

اس نے جیب سے کاغذات نکالتے ہوئے اطمینان سے دریافت کیا۔ وہ ہونٹ نے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ مگر شا پرچہ جی گریڑی تھی۔

”تم نے اس سے شادی کب کی؟“ اس کی آواز جیسے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی اسے ایک قابل توجہ نظر کے لیے ترسانے والا مرد اتنی آسانی سے رائے جیسی سیدھی سادی لڑکی کے آگے ہتھیار پھینک دے گا۔

”آپ باریخ بڑھ سکتی ہیں۔ ویسے چاروں گزر چکے ہیں۔“ اس نے نکاح نامہ شا کی فیل پر رکھ دیا۔ جسے بغور ملاحظہ کرتے ہوئے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ بے شک اس نے اسے پانے کے خواب نہیں دیکھے تھے مگر اتنا تو یقین تھا کہ میرا نہیں ہے تو کیا ہوا کسی اور کا بھی تو نہیں ہے۔ اب یہ خوش فہمی بھی دم توڑ گئی تھی۔

”ویسے میں دادوں گا آپ کی پاس کی اور فرمان صاحب کی مشترکہ پلاننگ کو۔ اتنی خوب صورتی سے اس کے گرد جال بچھایا تھا کہ اگر خدا کی کرم نوازی نہ

ہوتی تو رائے کبھی نہ بچ سکتی۔ پہلے فرمان صاحب کے گھر بھجوا کر اور پھر جعلی پولیس والوں کا ڈرامہ رچا کر۔ خیر ایک لحاظ سے تو میرے ساتھ نیکی ہی کی۔ اس ڈرامے کے باعث مجھے مشقت میں پڑے بغیر زندگی بھر کی خوشی مل گئی۔ ورنہ دل کی بات زبان پر لانے میں مدتیں گزر جاتیں۔ اپنے فرمان صاحب سے کہہ دیجئے گا اب رائے کی طرف اگلا قدم یہ سوچ کر رکھائیے گا کہ وہ کمپنی کی معمولی سیلر ایگزیکٹو نہیں میری بیوی ہے۔

وہ بزدل چوہے والیں جا چکے تھے۔ لمحوں میں صورت حال بدل چکی تھی۔ اسفندیار کو پاس کا انتظار تھا۔ ان کے آتے ہی اپنا اور رائے کا استعفیٰ انہیں تھا دیا۔ جب رائے سے اپنے تعلق کا ذکر کیا تو پاس صاحب کامنہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”سر! قاعدے کے مطابق ہم دونوں پندرہ دن پہلے نوٹس دے چکے ہیں، لہذا اب ہمیں اجازت دیجیے۔“

”مگر تم میری کمپنی کیوں چھوڑنا چاہتے ہو۔ کوئی شکایت ہے تو مجھے بتاؤ اگر رائے کے سلسلے میں خفگی ہے تو میں ابھی فرمان سے بات کر کے معاملہ پنپا لیتا ہوں۔ وہ آئندہ تمہاری بیوی کا نام بھی زبان پر نہیں لائے گا۔“ پاس کا لہجہ کمزور اور گھبرایا ہوا تھا۔ اسفندیار ان کا پرانا دور کرتا تھا۔ ایک مدت سے فیکٹری کا سارا کام سنبھال رکھا تھا۔

”زبان پر تو اب وہ واقعی نہیں لائیں گے۔ میں جسٹسٹ نیاز فاروقی کے ذریعے انہیں نوٹس بھجوا چکا ہوں۔ آپ کے ساتھ کام کرنے سے معذرت خواہ ہوں کہ میں اپنی ذاتی کمپنی کھول رہا ہوں۔ آفس سیٹ ہو چکا ہے۔ اب کام شروع کرنے کی دیر ہے بس۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی آفیشلی آپ سے ملاقات رہے۔ بہر حال اجازت دیجیے گا۔ اور رائے۔“

کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ ثنائے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اسفندیار نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ”یہ مضبوط قلعہ تمہارے ہاتھوں میں خیر ہونا تھا سو ہو گیا۔“ ثنائے ٹھنڈی سانس بھر کر دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”جی فرمان صاحب۔“ ثنائے بات کر رہی ہوں ”آپ سے عرض کرنا تھا کہ رائے والا معاملہ بھول جائیے۔ اب وہ عام لڑکی نہیں ہے۔ سزا اسفندیار ہے۔ وہی جو رائل کمپنیز کے نام سے اپنا آفس اسٹیشن کر رہا ہے۔ وہ بچھا ہوا تجربہ کار بندہ ہے۔ دونوں میں اس کا کاروبار ترقی کرے گا۔ ایسا نہ ہو اس کی بیوی سے لڑنے کے نتیجے میں آپ خود ہی پھنس جائیں۔ وہ ساری اسکیم جان چکا ہے۔ پھر اس نے تفصیلات بتا دیں۔

”مجھے ابھی ابھی دونوں لڑکوں نے بتایا ہے۔ بھئی باز آئے ہم۔ ایک لڑکی ہی تو ہے کوئی حید عالم تو نہیں ہے کہ جان کی بازی لگادیں۔ وہ تو اس کے اکٹھے ہوئے دوسرے نے مجھے خمد ولادی بھی۔ خیر اب لعنت بھیجیں اس سارے لغزے پر۔ کل مجسٹریٹ نیاز فاروقی کا فون بھی آیا تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ ورنہ نوبت یہاں تک نہ آتی۔ آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ معمولی سے گھرانے کی بے سار لڑکی ہے۔ صرف ایک بیمار ماں ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ دھمکانے پر خود بخود راہ راست پر آجائے گی۔ کیا خبر تھی۔ راتوں رات ”شوہر“ بھی آگ آئے گا اور وہ بھی ایسا زور آور کہ آتے ہی قانونی کھیرے میں لے لیا۔ میری سواہر تو بہ۔ لڑکیاں بہت ہیں مگر کاروبار کی ساکھ خراب ہو جائے تو پھر سب ختم۔“

فرمان نے گویا خود بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔

اسلام آباد کا موسم بڑا منچلا ہے۔ صبح اچھی خاصی دھوپ تھی مگر اب دو گھنٹے بعد جب وہ لوٹ رہے تھے تو ہلکی ہلکی بوند باریش ہو رہی تھی۔ شفاف سڑکیں دھل کر چمک رہی تھیں۔ مارگلہ کے بلند و بالا پہاڑ بھی یہ خوشگوار بوند باریش انجوائے کر رہے تھے۔ ان کی گہری

خوشیاں بادلوں کی اوٹ میں سیاہی مائل لگ رہی تھیں۔ ٹریفک کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے اسفندیار بڑے ریلیکس موڈ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی سبز سوئی شلواری لہیں اور سرخ روپے میں ملبوس رائے گرون موڑے موسم کی خوب صورتیاں نظروں میں جذب کر رہی تھیں۔

اسفندیار گاہے بگاہے اس پر نگاہ ڈال کر اس کی محویت ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ بظاہر موسم کی سرمستی دیکھ رہی تھی مگر درحقیقت سوچوں کی اٹھان میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے حواس ابھی تک منتشر تھے۔ ثنائے اور پاس کی ملی جھلت نے اسے کس درجہ اذیت پہنچائی تھی۔ ثنائے اس حد تک بھی گڑبگڑ سکتی ہے؟ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہی تھی جس نے اسے فرمان اینڈ سٹریٹس سے ملنے کو کہا تھا۔ اور یہ وہی تھی جس نے اسے ایک بجے ایف ایون سکیئر جا کر مارکیٹنگ کرنے کی ہدایت دی تھی اور یہ وہی تھی جس نے قاتلانہ حملے کا لیس اور پھر جعلی پولیس کا ڈرامہ ادا کر کے اس کی راتوں کی نیندیں حرام کی تھیں۔

اسفندیار کے کہے ہوئے جملے حافظہ میں شور مچانے لگے۔

”زیادہ تیر مار خان بننے سے پہلے اپنے اطراف سے ہوشیار رہنا سیکھیں۔“ اور اس کا اشارہ یقیناً ثنائے اور پاس کی بیچ دار شخصیت کی طرف تھا مگر اس نے سمجھنے کی چنداں کوشش نہ کی تھی۔

”آپ کے گرد تھاہوں والے لوگ پھرتے ہیں۔ ہوشیاری نہ دکھائی تو ان کے جال میں پھنس جائیں گی۔“ اس نے اس وقت سے پہلے خبردار کیا تھا۔ ”دار کرنے والا بسا اوقات عین آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے مگر اسے شناخت کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اس نے طنز کے ذریعے اسے سمجھایا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ثنائے اور پاس کی بچھالی گئی بساط میں الجھ گئی۔

”مجھے دوست دشمن کی پہچان ہے۔“ اس کا دعوا کرتا غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ واقعی نادان تھی۔

”کمال حماقت یہ ہے کہ تم ابھی تک سامنے کا بندہ نہیں دیکھ سکیں۔“ اس نے کس بری طرح جھنجھلا کر ڈانٹا تھا اور اسے اعتراف تھا کہ واقعی اسفندیار درست کہا تھا۔

”اس حکمت عملی کا کیا فائدہ ہوا۔“ وہ شادی کی رات کتنا ابھی تھی اور آج اپنی آنکھوں سے فائدہ دیکھ لیا تھا۔ اسفندیار نے اتنا بکا بندوبست کیا تھا کہ فرمان صاحب جیسے دس بھی آجائے تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ یوں بھی مسئلے کا سامنا کرنے کے لیے جتنی جرات اور عقل ہوتی ہے اتنا ہی جلدی نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

”آپ ثنائے کو کب سے جانتے ہیں؟“ وہ اچانک ہی اس کی طرف رخ موڑ کر پوچھ بیٹھی۔

”آج سے آٹھ سال پہلے جب میں نے یہ کمپنی جوائن کی تھی۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تینا مجھ سے دو سال پہلے آئی تھی۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اس جیسی اہلکار ہے ضروری لڑکی اتنی خطرناک ہوگی۔“ رائے کا لہجہ نرم اور شرمندہ سا تھا۔

”اسی بات کا تو رونا تھا کہ تم اسے اور پاس کو کمال معصومیت سے اپنی تقیث اور شک کے دائرے سے خارج کر چکی تھیں۔ اگر شروع سے انہیں بھی دوسروں کی طرح تہہ دار شخصیت سمجھ کر محتاط رہتیں تو یہ نوبت نہ آتی۔ تم ڈیڑھ ماہ یہاں کام کر کے بھی دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جان پائیں اور تمہارے سوا سارے ورکرز جانتے ہیں کہ سر اور ثنائے گزشتہ دس سال سے بغیر نکاح کے ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

”کیا۔“ اس کا دماغ ٹھک سے اڑ گیا۔

”جی۔“ وہ اس کی پھلی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

”یہ جو ہر چوتھے دن دونوں ڈیڑھ دو گھنٹوں کے لیے ”مینٹنگ“ پر جاتے ہیں یہ دو تین اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور دل تھام کر یہ خبر بھی سن لو کہ ثنائے شادی کو بارہ برس گزر چکے ہیں۔ وہ گیارہ سالہ لڑکی سات سالہ لڑکے اور ایک چار سالہ بچی کی ماں ہے۔ اس کا شوہر واپڈا میں گریڈ سولہ کا ملازم ہے۔“

23

رائے کو لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں رک جائیں گی۔ یا خدا پرست در پرست تھے چھتے لوگ صد شکر کہ میں اس جہنم سے بخیریت واپس لوٹ آئی ہوں۔

”اور اس کا شوہر کیا وہ نہیں جانتا کہ شا اور باس۔“ اس سے آگے اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کا سر بے اختیار جھک گیا تھا۔ عورت کا یہ کون سا روپ تھا۔ ایک بیوی، ایک ماں ہوتے ہوئے عصمت و عفت کے ہر تصور سے کوسوں دور تھی! جب ہی تو شا نے رائے کو ہدایت کی تھی کہ شرم و حیا اور جھجک سے کام نہیں لینا چاہیے۔

وہ سب جانتا ہے مگر آج کے دور میں بے غیرت اور تعیش پرست مردوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ جب شا نے جاب شروع نہیں کی تھی تو وہ ایک معمولی سے کوارٹر میں رہتے تھے اور شاید تا عمر اسی تنگ و تاریک جگہ پر گزار بسر ہوتی اگر شا جاب کے بعد باس کی مہربانیوں کی بارش میں نہ بھیگی۔ اس کا خاوند جانتا ہے کہ بنگلہ، کار، بیش قیمت ساز و سامان، بچوں کا انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کھلی رقم اس کی بیوی نے باس کو اپنے حسن کا خزانہ دے کر حاصل کی ہے اور اگر اس نے روایتی غیرت دکھانے کی کوشش کی تو سب کچھ پھن جائے گا۔ سو وہ جان بوجھ کر کانوں میں روٹی لپیٹے یہ سب نظر انداز کیے ہوئے ہے اسی میں اس کی عافیت ہے۔

”اف خدایا۔“ اخلاقیات کا یہ حشر دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔ مانت پرستی نے جس طرح اعلیٰ اقدار کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالی ہیں اور نکالیا اسے گھن نہیں آئی خود سے، باس سے اور اپنے بے غیرت خاوند سے اس نے بے اختیار جھڑپ جھڑپ لی تھی۔

”اور ایک بات شا باس سے بھی چھپائے ہوئے ہے کہ وہ بھی کبھی باس سے بھی بے وفائی کر گزرتی ہے۔ بشرطیکہ بندہ اس کے اونچے معیار پر پورا اترتا ہو“ اسفندیار نے اپنے انکشاف کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

ہاں اس بات کی تو وہ خود گواہ تھی۔ کس طرح اسلحہ یار کو بہانے بہانے سے بلا کر روک کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ طاہرہ خالہ نے کہا تھا۔

”ارے بی بی! اس عورت کا کس کے ساتھ پنک نہیں ہے۔ طبیعت ہی ماشاء اللہ ایسی پائی ہے۔“ ایک وی اس کی گھناؤنی شخصیت کے تاریک پہلوؤں سے بے خبر رہی تھی۔

اس نے چوری سے اسفندیار کی طرف دیکھا۔ اس کی طرف کی کھڑکی کا پورا ایشیہ نیچے تھا۔ اس لیے سرد ہوا براہ راست اس سے ٹکراتی تھی۔ جس نے اس کے گندی رخساروں پر سرخی سی بھرا دی تھی۔ اس کے چاکلشی بال قدر بے ترتیب ہو کر پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ سیاہ جینز اور لائٹ پنک شرٹ میں اس کا لانا سر لایا پیشہ سے زیادہ سویر اور پروقار نظر آ رہا تھا۔ واقعی کچھ تو تھا اس میں کہ اس کے روکھے پھیکے طرز عمل کے باوجود شا اپنے قدم نہ روک سکی تھی۔

اسی لمحے اسفندیار نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ نظریں ملنے پر وہ خفیف سا مسکرایا۔ رائے نے گھبرا کر دوبارہ کھڑکی کی طرف رخ موڑ لیا۔ اس کی مسکراہٹ میں جو کچھ تھا وہ اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

شادی کو چار روز ہو چکے تھے مگر دونوں کے درمیان وہی اجنبیت دوری اور تکلف تھا جو ہمیشہ سے رہا تھا۔ وہ بیڈ روم میں سوئی تھی اور اسفندیار ڈرائنگ روم میں۔ جیسے ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا۔ دونوں کپنی کے لیے اکٹھے نکلتے تھے۔ کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے اور بس۔ آپس میں گفتگو یا تعلق رائے نام ہی رہا تھا۔ اتنے دن کے بعد آج ان میں تفصیلی گفتگو ہوئی تھی اور وہ بھی شا کے حوالے سے۔ اب پھر خاموشی تھی۔

اور وہی خاموشی ان کا حال دل ستا رہی تھی۔ ایک کہنا چاہتا تھا۔ ”سی پور پر عمر گزار دو اب یہاں سے کہیں نہ جانا۔“ دوسرا یہی کہنا چاہتا تھا۔ ”مجھے اعتبار دلاؤ کہ تمہاری پناہ میں جبر نہیں محبت کی گری ہے۔ تم ساری عمر مجھے پھولوں کی طرح رکھو گے۔ سخت لہجوں اور سرد سپاٹ رویوں سے میرا روپ نہیں

کہناؤ گے۔ مجھے رکھائی اور آدم بیزاری کی مار نہیں مارو گے۔ مجھ سے محبت کرو گے صرف میرے لیے، گزارے کے لیے نہیں۔

”ارے امی! آپ بارش میں سڑک پر گھوم رہی ہیں۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“ بلڈنگ کے قریب آتے ہی امی کو بھیگی سڑک پر ہلکی ہلکی پھوار میں چل قدمی کر کے دیکھ کر وہ کھڑکی سے پیچنی تھی۔ اسفندیار نے امی کے قریب گاڑی روک دی تھی۔

”میں بہت مزے میں ہوں بیٹے۔ میری فکر نہ کرو۔ اک عمر کے بعد اتنا سکون اترا ہے دل میں اور یہ ہوا تو بہت مہربان لگ رہی ہے۔“

امی کے چہرے پر بچوں کی سی سادگی اور سکون رقم تھا۔

”تم بتاؤ۔ آج ہو گئے ان زنجیروں سے آزاد۔“ ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔

”جی ہاں امی جان۔“ اسفندیار نے جی جان سے انہیں مخاطب کیا تھا۔ امی نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی تھیں رائے۔“ وہ کھڑکی کے پاس دیوار سے پشت ٹکا کے دونوں بازو سینے پر لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لہجہ خاصا نرم

تھا۔

”میں آپ کو پسند نہیں کرتی تھی۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

”وہ کیوں؟ میرا مطلب ہے کوئی خاص وجہ؟“ وہ بغور اس کی موٹی موٹی چمکدار آنکھوں، عنابی بھرے بھرے لبوں اور سلکی دراز بالوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے نقوش کی جاذبیت میں بے خبری کے رنگوں نے عجب مقناطیسیت بھر دی تھی۔

”آپ کی بد مزاجی اور سخت رویے کی وجہ سے۔“ آپ بہت روکھے پھیکے اور ”سٹاڈنٹ“ شخص ہیں۔ جھڑکنے اور نصیحت کرنے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں۔“ اسفندیار کو ہنسی۔ تو بہت آتی مگر وہ ضبط کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ دبا گیا مبادا اس کا موڈ بگڑ جائے۔

”تم نے موقع ہی کب دیا ورنہ اور بھی بہت کچھ دکھا دیتے اور تم سے کس نے کہا کہ میں روکھا پھیکا انسان ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر کسی کو لفت نہیں کراتا۔ نہ ہر لڑکی کو خود سے فری ہونے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میری محبت، ہنسی، خوشی، مسکراہٹ اور لطیف جذباتوں پر صرف اس کا حق ہے جسے دل میں اور گھر میں پسایا ہے اور جو تا عمر یہیں رہے گی اور میں بد مزاج بھی ہرگز نہیں ہوں۔ بس اتنا ہے کہ شروع سے اکیلا رہا ہوں اور اکیلا شخص یا تو دیواروں سے بات کر سکتا ہے یا تصوراتی محبوب سے اور لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب تم میری زندگی میں آ گئی ہو تو دیکھنا سارا چرچا پن اور آدم بیزاری اڑ چھو ہو جائے گی اور کچھ؟“

رائے نے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نرم نرم سی چمک تھی۔ پھر وہ کھڑکی چھوڑ کر اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور پچکے سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

”آپ جن بھوت کی طرح میرے پیچھے کیوں پڑ گئے تھے اور ہر جگہ میری حفاظت کو کیسے پہنچ جاتے تھے۔ آپ نے میری اتنی مدد کیوں کی؟“ سوال پوچھنے کا انداز ایسا تھا گویا یہ بھی جرم میں شامل ہو۔ اسفندیار کو بے

اختیار ہنس آنے لگی۔ وہ کسی بچے کی طرح منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

”کیونکہ یہ دل کا معاملہ تھا۔ بس یا کچھ اور۔“ وہ بڑے خوب صورت انداز میں مسکراتے ہوئے جھکا۔

”یار! اور کتنا نام لوگی راضی بنائے میں۔ دیکھو میں روز روز راتنگ روم کے صوفے پر سکرسمٹ کر نہیں سو سکتا۔ یوں بھی کل سے ای جان آجائیں گی یہاں۔ وہ ہمارے آپس کے خوشگوار تعلقات کی براہ راست جھلک ملاحظہ کریں گی تو ان کی ایک مدت بعد سنبھلی ہوئی طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔ کچھ تو خیال کرو۔“

”وہ کیوں آئیں گی یہاں۔“ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

”تو کیا انہیں اکیلا چھوڑ دیں گے۔“ وہ سخت خفا ہوا اور ڈانٹ کر کہنے لگا۔

”رسول پہلی تاریخ ہے۔ مالک مکان کرایہ لینے آئے گا تو اسے فلیٹ کی چابی پکڑا دیں گے۔ جب بیٹے کا گھر موجود ہے تو کرائے کے فلیٹ میں کیوں رہیں۔ یہ تو شادی کی بات کے ساتھ ہی طے ہو چکا تھا۔ میری طرف سے یہی شرط ٹھہری تھی۔ انہیں بہر حال مانتی پڑی۔ تم نے بہت ناز اٹھوا لیے ان سے۔ اب میری باری ہے۔“

رائہ کا دل خوشی سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ یہی تو واحد پھانس تھی جو ابھی تک دل سے نہیں نکل پائی تھی۔ بیمار ماں کو تنہا فلیٹ میں چھوڑنے کے خیال سے جیسے کوئی دل مٹھی میں بھیج لیتا تھا۔

”ساتھ والے کمرے میں ایک سنگل بیڈ، دو کرسیاں اور میز موجود ہے۔ کتابوں سے بھری ایک لکڑی کی الماری ہے۔ اس کمرے کو میں نے اسٹڈی روم بنایا ہوا تھا۔ جب مطالعے کا موڈ ہوتا تو رات کو اوھر ہی پڑھتا پڑھتا سو جاتا۔ میں شام تک کتابوں کی الماری بیڈ روم میں سیٹ کر دوں گا تاکہ امی جان اپنی دیگر چیزیں وہاں ایڈجسٹ کر سکیں اور ہاں اب تم سلیقہ مند بیویوں کی طرح کچن سنبھال لو۔ یہ اطلاع مل

چکی ہے کہ کھانا پکانے میں خاصی گنتی گزری ہو۔ اس لیے شروع کی غلطیاں معاف۔ لیکن دو ماہ کے ٹریڈ پیریڈ کے بعد سخت چیکنگ ہوا کرے گی۔“ اس رائہ کے بالوں سے ٹپکتے ہوئے اسے ڈرایا۔

”آپ تو خود اتنا اچھا کھانا پکا کر لیتے ہیں۔“ اس نے بھولا سامنے بتایا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا، یعنی شادی کے بعد بھی میں خود پکاؤں گا۔“ اس نے مصنوعی تحیر سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”کیا حرج ہے۔“ اس کی سادگی و معصومیت قابل دید تھی۔ ”میوں بھی میرے ساتھ کام میں ہاتھ توڑنا میں گے ناں۔“

”منظور ہے مگر سوچ لو۔ لڑائی بہت ہوا کرے گی۔ کیونکہ آپ بھی کچھ کم ضدی اور جھگڑالو واقعی نہیں ہو میں۔ میں اپنی ترکیب بتاؤں گا اور آپ اپنے طریقے پر ڈٹی رہیں گی۔“

وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر مسرور کن انداز میں اطلاع دے رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے آدم ہزاری اور سخت دلی کا ٹائٹل دیا گیا تھا۔ جس کے لیے ہنسنا مسکراتا منع تھا۔ آج وہ اتنے نرم گرم پیار بھرے شگفتہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ اسے ہنسنا تھا۔ اعتبار اور پیار کی مہریں ثبت کر کے اپنے اندر چھپی محبت کا اظہار کر رہا تھا اور رائہ کو زندگی ایک نیا سبق پر دھاری تھی کہ ہر مرد کے اندر ایک نرم و لطیف مرد چھپا ہوتا ہے بشرطیکہ کھوجنے والا صحیح پہلو پر دستک دے۔ یہ رکھائی و ہزاری اور غصہ و غضب تو دیواریں ہوتی ہیں اپنے اندر کی محرومی کو دوسروں کی نظر سے بچانے کے لیے دیوار کے اس پار اک موم کا پتلا ازل سے اپنے من پسند فنکار کا خطر رہا ہے اور وہ جانتی تھی اس کی خوش باش رفاقت اسفندیار کی زندگی کی ہر محرومی کا ازالہ کر دے گی۔ اب اسے کسی دیوار کی ضرورت نہیں رہے گی کہ اب ہر منظر صاف شفاف اور واضح ہو گیا تھا۔



گھریلو مسائل کی

”نیرا! ارے بچی آؤ، تم ہی سمجھاؤ اسے، میری بات تو اسے برداشت ہی نہیں ہوتی۔“ نصیوہ آپا نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر پکارا۔

”کیا ہو گیا بھئی؟“ نیرا ہاتھ میں پکڑی حلوے کی پلیٹ، چاول چنتی ربیعہ کو تنہا کر نصیوہ آپا کے قریب تخت پر بیٹھ گئی۔

”وہی پرانا قصہ ہے بھابھی!“ ربیعہ بیزاری سے بولی۔

”لڑکی جوان کیا ہوئی گویا جرم عظیم کر ڈالا اس نے۔ اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، آنے جانے پر پابندی، منسنے بولنے پر ڈانٹ پھٹکار، کام کرو تو نقص نکال نکال کے جی جلا دیا اور نہ کرو تو ہڈ حرامی کے طعنے دے دے کر نفسیاتی مریض بنا ڈالا۔“

”اے ہٹو! تمہیں تو آپا نے پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اصل بات یہ۔“

”اصل کیا تو نقل کیا، سو باتوں کی ایک بات۔ مرغی کی وہی ایک لٹنگ ہے کہ ہاں کروں، ان کی عزیز خالہ زاد بہن کے عزیز ترین بیٹے کے لیے۔“ ربیعہ نے برا سامنے بنایا۔

”ہاں تو حرج ہی کیا ہے بھئی۔“ نیرا نے نصیوہ آپا کا ساتھ دیا۔

”تم ہی کہو نیرا! اپنے دیکھے بھالے، جانے پہچانے رشتے اچھے ہوتے ہیں یا انجان اور بیگانے لوگوں سے رشتہ داری اس آتی ہے۔“ نصیوہ آپا نے تائید چاہی۔

”اگر اپنا دیکھا بھالا لڑکا قابل، ذمہ دار اور حساس فطرت کا مالک ہو تو کیا ضرورت ہے غیروں کے خحرے

اٹھانے کی۔ آدھی عمر تو غیروں کے موڈ اور مزاج میں گزر جاتی ہے، آگے پیچھے کا کوئی تحفظ نہیں، عجب بے سرو سامانی اور بے سائبانی کا سا عالم طاری ہے۔ دیکھے بھالے رشتے کے عیب ہنر دکھائے ہوئے جو جیسا ہوتا ہے سامنے آ جاتا ہے۔

غیروں سے نباہ کے لیے پہلے انہیں اپنا بنانا ہے۔ اپنا بنانے کے لیے ان کے دل تک پہنچنا اور دل تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملتا کہ ہر غیر

ذات میں ڈھیروں ڈھیروں اسراریت لئے ہوئے ہے۔ کھل کے ہی نہیں دیتا۔ میری مثال تو آپ سامنے ہے آپا۔“ نیرا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”میرا باپ تو آخری لمحوں تک مجھے سمجھاتا رہا کہ اس لڑکے میں زندگی گزارنے کے صحیح اور سچے گہرے نہیں آتے۔ تم اس کے ساتھ خوش نہیں رہو، ابھی تو بھائیوں کے سر پر ہے اس لیے بے فکر

فراغت کے مزے لوٹ رہا ہے کل کو اپنے کانڈ صدمہ بوجھ آیا تو ڈھویا نہ جائے گا، سو وہی ہواناں شاہی۔ بعد بھائیوں نے اس کے حصے کی ایک دکان اس کے

سپرد کر کے کاروبار الگ کر دیا۔ آبائی گھر بیچ کر رقم میں تقسیم کر لی کہ چاہو تو اس سے اپنا گھر بنانا شروع کر

چاہو تو کرائے کا مکان لے کر باقی رقم بینک میں ڈال دو، باقی دونوں بھائیوں نے تو عقل مندی کا مظاہرہ کر

ہوئے وہی رقم کاروبار میں لگا کر ایک شاپ سے ہر ڈیپارٹمنٹل اسٹور بنالیا اور ان صاحب نے اپنے ایف ایون جیسے یوش سیکٹر میں بیس ہزار روپے

جھلائی ہیں بعد میں اسی کے خوابوں اور دھوکوں کو بھلا دیا
بنا کر تم رویا کرو گی۔“

”ارسلان! اب اٹھ بھی جاؤ دس بج رہے ہیں مگر
جاؤ گے دکان پر۔“ وہ کب سے اس کے سر پر ہینڈ بھا
رہی تھی۔

”اٹھ جاتا ہوں یار! ایک تو تمہیں میں آرام کرتا ہوں
بہت برا لگتا ہوں۔“

وہ کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ نیرا کو غصہ آنے لگا۔
اس کی یہی حرکتیں تو اسے طیش دلاتی تھیں۔ وقت
کی قدر نہ کرنا اپنے موڈ کے حساب سے کام کرنا اور تن
آسانی کی عادت گویا ارسلان کی گھنٹی میں پڑی ہوئی
تھی۔ سونا اور گھومتے پھرتے موج اڑاتے رہتا۔ اس کی
زندگی کا اس سے زیادہ اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

”خود ہی تو کہتے ہو۔ ٹائم سے جاؤں تو پھر کچھ کمائی
ہوگی۔ اب ٹائم سے جگاتی ہوں تو اٹھتے نہیں ہو۔ اس
طرح کاروبار نہیں ہوا کرتا ارسلان!“

”بھی تو دس ہی بجے ہیں ساڑھے دس بجے تک
میں جا کر دکان کھول لوں گا۔“ وہ غنودگی میں اسے ٹال
رہا تھا۔

”بھی اٹھو گے تو ساڑھے دس تک پہنچو گے ناں۔
آدھا گھنٹہ تو تمہیں واش روم کے لیے چاہیے پون
گھنٹے میں ناشتہ ہوگا۔ مزید آدھا پون گھنٹہ کام پر جانے
کے لیے ہمت جمع کرنے میں لگ جائے گا روز کی طرح
پھر بارہ ساڑھے بارہ بجائے نکلو گے۔ اس وقت تک
لوگ آدھے دن کی کمائی کر چکے ہوتے ہیں۔“ وہ جھنجھلا
رہی تھی۔

”کیا صبح صبح سر کھانا شروع کر دیتی ہو۔ کہا ہے ناں
اٹھ رہا ہوں۔“ وہ دوبارہ جھنجھوڑے جانے پر سخت
برافروختہ ہوا۔

”بچھلے پون گھنٹے سے جگانے کا یہ فریضہ انجام دے
رہی ہوں اس سے زیادہ اسٹیمنا نہیں ہے مجھ میں۔“
”فہ! گویا جگانا بھی مجھ پر احسان عظیم ہو گیا۔“

کرایے پر شاہانہ کمرے کرایہ مال کے اندر اندر
ساری رقم اجاڑ دی۔ بمشکل پندرہ ہزار بچے جن سے
اس چھوٹے سے فلیٹ کا چھ ماہ کا کرایہ اور گھر کے لیے
کچھ راشن پانی آیا۔ سال بھر سے شاپ ملازم کے
آمرے پر چل رہی تھی۔ یہ موصوف ٹھاٹھ سے گھر
پڑے آرام کرتے یا باہر گھومتے پھرتے رہتے اب
ہرش آیا تو دکان کی خبری سارا کام دھندل چوٹ ہو کے
رہ گیا۔ ظاہر ہے اب جان مارے بغیر گزارا نہیں
ہو سکتا تھا۔ ایک نشہ ہوتا ہے جیب میں پڑا ہو تو حالات کی
حقیقی تصویر دکھائی ہی نہیں دیتی جب جیب خالی ہو جاتی
ہے تب ہوش ٹھکانے آتے ہیں۔“

نیرا نے بے لاگ سا تبصرہ کیا۔
”کلاس فیلو ہے اس کا ساتھ پڑھتا ہے۔ کہہ رہی
ہے اس کی ماں آئے گی رشتے کی بات کرنے صاف
بات ہے مجھے تو یا سر پسند ہے اپنے خاندان کا بچہ ہے۔
پڑھا لکھا اور برسر روزگار ہے۔ ادب اخلاق والا ہے
غیروں کا کیا پتا کس طبیعت کا نکلے۔ یہ بضد ہے کہ ادھر
نہیں کرنی۔“

نصیو آپا کے کہنے پر نیرا نے ربیعہ کو بہتیرا سمجھایا
بجھایا مگر ربیعہ اپنے ارادے پر قائم رہی۔
”ہونہ! اپنے وقت میں من مانی کر کے اپنی پسند کی
شادی کر لیتے ہیں اور جب دوسروں کا وقت آتا ہے تو
نصیحتوں کی پونہ لے لیے آجاتے ہیں۔“

ربیعہ نہ صرف دل میں سوچ رہی تھی بلکہ یہ خیال
اس کے رویے کے ذریعے نیرا تک بھی پہنچ رہا تھا۔
”ابھی تم نے پل صراط کا یہ رستہ عبور ہی کہاں کیا ہے
لیلی! تیرا دل میں سوچا۔“

”بور کے یہ لٹو کھا کے تم بھی پچھتاوے کا شربت
چکھ کے دیکھ لو۔“

پسند کی شادی کر کے بندہ نہ آگے کا رہتا ہے نہ پیچھے
کا۔ اپنا بھگتان خود بھگتنا پڑتا ہے۔ بابا ٹھیک ہی تو کہتے
تھے کہ تمہارا انتخاب ایک نکما، ست اور کم عقل لڑکا
ہے ابھی اس کی باتیں تمہیں آسمان کے جھولے

بھڑکتے تھے۔ دروازوں کی کڑی دیکھ رہی تھی۔ فرش
میں بے توازن اور بھدا تھا۔ دیوار گیر شامت اور
الماریاں سیلن کی وجہ سے ناقابل استعمال ہو گئی
تھیں۔ واش روم کے فلش کی پانی والی ٹنگی خراب
تھی۔ لوٹے سے پانی بہنا پڑتا تھا اس کے جیز کا صوف
سیٹ بیڈ روم سیٹ اور ڈائننگ ٹیبل دیواروں سے
جھڑنے والے چوڑے اور مٹی سے اٹے رہتے تھے
چیزیں بار بار صفائی کے باوجود دوبارہ گرد آلود ہو جاتی
تھیں۔

وہ بار بار خود کو صبر اور برداشت کا سبق پڑھا کر اس
ماحول میں کام کرنے کے لیے آمادہ کرتی تھی ظاہر ہے
اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

ارسلان سرگڑتا تھا روم سے برآمد ہوا تھا۔
”کیا عذاب ہے۔“ آج کل یہ جملہ ارسلان کا تکیہ
کلام بننا ہوا تھا۔

”گرم پانی ہی نہیں آ رہا۔ ٹھنڈ میں اکڑ گیا ہوں میں
تو۔“ مسموم بدل گیا ہے اب گرم پانی سے شاور لینے کی
کیا تک جاتی ہے۔“ وہ چائے دم کر رہی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھرو (سائیکالوجی)

شائع ہو گیا ہے

خوبصورت سرورق، آفٹ چھپائی، مضبوط جلد،

قیمت 600 روپے

پتہ ذیل سے خریدیں

● مکتبہ عمران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی

● احمد نیوز ایجنسی، فریئر مارکیٹ کراچی

● سلطان نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ لاہور

● اشرف بک ایجنسی راولپنڈی ● مہرا نیوز ایجنسی حیدرآباد

● جدید ڈاک منگوانے کا پتہ ● مکتبہ عمران ڈائجسٹ کراچی 37 اردو بازار

بروز کرتا تھا روم میں گھس گیا۔
”تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے ہمیں یہ دن
دیکھنے کو ملے ہیں۔ جو وقت کی قدر نہیں کرتا وقت اس
کو روند کر گزر جاتا ہے۔ اتنا کچھ گنوا دیا اب بھی ہوش
کی روانہ لی تو پھر کب لی۔ اپنے دونوں بھائیوں کو دیکھو۔
ان کو بھی تو ایک دکان اور مکان کی ایک مخصوص رقم ملی
تھی عقل مندی سے کام لے کر آج وہ کہاں ہیں اور ہم
وہ رقم سال کے اندر خاک کر چکے ہیں۔“
”تم نے پھر وہی ہمیشہ والی طعنے بازی شروع کر دی۔“
وہ تلملایا۔

”طعنے بازی کی کیا بات ہے جو حقیقت ہے وہی بیان
کر رہی ہوں۔“ وہ جل کر بولی۔

”ہو نہ حقیقت بیان کر رہی ہوں زندگی اجیرن
کر کے رکھ دی ہے۔“ ایک دھاڑ کے ساتھ دروازہ بند
ہوا تھا اب واش روم میں سے آواز آرہی تھی۔
”اچھا خاصا پرسکون اور عیش و آرام والی زندگی گزار
رہا تھا۔ بھابھیاں کھانا پینا وقت پر اور حسب خواہش
دے دیتی تھیں۔ بھائیوں سے تفریح کے لیے معقول
رقم مل جاتی تھی نہ فکر نہ فاقہ۔ اپنے دن تھے اپنی
راتیں تھیں۔ لے کر الجھا دیا مجھے روٹی وال کے چکر
میں۔“ وہ با آواز بلند برہنہ رہا تھا۔

نیرا کی جان جل کر رہ گئی۔

”بتا تو میری زندگی ہوئی ہے۔ پچھتاتی ہوں اس
وقت کو جب بابا کا انتخاب رد کر کے ان کے سامنے
تمہارے لیے تن کر کھڑی ہوئی تھی۔ تمہارے حق
میں دلائل دے کر اپنے تئیں اپنی سمجھ داری اور دور
اندیشی کا ثبوت دیا آج روتی ہوں اس گھڑی کو۔“

”بہت دکھ ہے بابا کا انتخاب رد کرنے کا تو اب بدوا
کر ڈالو۔ جاؤ اسی ”انتخاب“ کے پاس۔“ وہی روایتی
مردانہ خود پسندی اور اتنا برستی کا مظاہرہ۔ وہ گلے کر
پاؤں پختی، کچن میں گھس گئی۔

کچن کیا تھا گویا مرغی کا ڈربہ تھا۔ صرف کچن ہی کیا
پورا فلیٹ ہی بوسیدگی، سیلن اور ٹوٹ پھوٹ کا نمونہ
تھا۔ دیواروں سے چونا اور ریت برابر مقدار میں

کبھی جاؤ دس بج گئے
کب سے اس کے سر پر

ایک تو تمہیں میں آرام

سو گیا۔ نیرا کو غصہ آ گیا
اسے طیش دلاتی تھی

کے حساب سے کام کرنا
سلان کی گھنٹی میں پڑنا

تے موج اڑاتے رہنا
کوئی مقصد نہیں تھا

م سے جاؤں تو پھر کچن
ہوں تو اٹھتے نہیں ہوں

ارسلان۔!“
”ساڑھے دس بجے

”وہ غنودگی میں آئے

دس تک پہنچے
روم کے لیے چائے

دھا پون گھنٹہ کام کرنا
لگ جائے گا روزی

کلو گے۔ اس وقت
لے ہوتے ہیں۔“

کر دیتی ہو۔ کہا ہے
موڑے جانے

نے کا یہ فریضہ انجام
نہیں ہے مجھ سے

کھڑے ہوئے

کے لیے فریضہ انجام
نہیں ہے مجھ سے

”مگر می ہویا سردی میں ہر موسم میں گرم پانی سے نہانے کا عادی ہوں۔“ وہ چڑھ کر بولا۔
 ”عادی تو میں بھی نہ جانے کن کن چیزوں کی تھی۔“
 اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”حالات کے مطابق اپنا آپ بدلنا پڑتا ہے۔ میں نے کیا ایسی زندگی کے خواب دیئے تھے، پڑھائی، دوستوں سے کپ شپ، آرام کی نیند اور کھانے پینے کی ہر چیز کی فراوانی، دن گزارنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ میں نے کہاں پائی تھیں دال روٹی پوری کرنے کی فکریں۔ بابا نے تو مجھ سے بھی چائے کا ایک کپ بھی نہیں بنوایا تھا۔ اب سارا دن جھاڑو پوچے، کھانا بنانے، کپڑے دھونے اور گھر کے بجٹ کو قابو میں رکھنے کی تدبیریں کرتے گزر جاتا ہے۔ مجھے پتا ہوتا کہ تم اس درجہ نا عاقبت اندیش اور آرام طلب انسان ہو تو۔۔۔“
 ”کیا۔۔۔“ وہ سگلا۔ ”آگے بھی بولویں نا کہ مجھ سے شادی کر کے بجائے بابا کے اس ”منتخاب“ کے لیے ہاں کر دیتیں۔ تو جاؤ اب کر لو ناں کس نے روکا ہے۔“
 ”اب۔۔۔“ وہ ہارے ہوئے انداز میں بولی ”اب ہاتھ میں کیا رہا ہے۔ اب تو سب کچھ ختم ہے۔“

”تمہارا حسن و جمال، شادی کے ڈیڑھ برس بعد بھی ویسا ہی تروتازہ ہے، بہتر ہے چاہنے والے مل جائیں گے۔ جاؤ ڈھیونڈ لو جا کر۔“ اس کی مردانہ انا پر گویا کاری ضرب پڑی تھی۔ لہجہ بلا کا سرد تھا۔

”میرے ساتھ تو اس لہجے اور انداز میں بات مت کیا کرو ارسلان۔۔۔“ وہ تکلیف سے بولی۔ ”ان ہی ہزاروں چاہنے والوں میں سے تمہارا انتخاب کیا تھا مجھے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ تمہیں کب اعتبار آئے گا مجھ پر۔“

وہ ان حالات سے سخت دلبرداشتہ تھی۔ کوئی پرانا کولیگ یا کلاس فیلو سر راہ مل جاتا اور ہائے ہیلو ہو جاتی تو دنوں ارسلان کا موڈ خراب رہتا تھا۔

”اگر مجھے ان سے دلچسپی ہوتی تو تم سے شادی کیوں کرتی۔ ان کی موجودگی میں میں نے تمہیں سلیکٹ کیا تھا۔“ وہ کتنی بار وضاحت کر چکی تھی۔

”کما ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ رہنا ہے۔ اب مجھے کہاں جانا ہے۔ شادی ایک بار ہوتی ہے بری ہے یا بھلی۔ اب تو کرنا میں تو تمہارے غیر ذمہ دار نہ رویے اور غیر مستقل مزاجی سے تنگ رہتی ہوں۔ تمہیں اپنے مستقبل پر غور کی کوئی فکر ہی نہیں ہے، جس دن زیادہ منافع ہوتا ہے اس دن کمائی کھرانے سے پہلے ہی خرچ کر آتے ہو۔ میں تمہیں ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ دن بھر کی بچتی آمدنی ہو تم مجھے تھمایا کرو، میں خود چپیریں خرید لوں گی۔ تم ضرورت کی چیزیں چھوڑ کر ہر غیر ضروری چیز کی خریداری کر لیتے ہو۔ ضرورتیں جوں کی توں رہ جائیں ہیں اور اس طرح گھر سے پیسے کی دانٹا کل کل بھی ختم نہیں ہوتی۔ تھوڑی رقم بھی سلیقے سے استعمال کی جائے تو گزارا کرنا مشکل نہیں ہوتا۔“

”میں نے کون سی بڑی بڑی رقمیں اجاڑ دی ہیں۔“ وہ تیوری چڑھا کر بولا۔ ”تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے میں نے ایک دن میں ہزاروں کما کر اڑا دیئے ہوں، کون سی فضول خرچی کی ہے میں نے۔“

”ہر دفعہ کی طرح تم اب بھی مکر رہے ہو۔“ تیراغ سے بولی۔

”ڈھائی ہزار دینا ہے فلیٹ کا کرایہ، آج پانچ تاریخ ہو گئی ہے اور گزشتہ پانچ دنوں سے مالک مکان باقاعدگی سے چکر لگا رہا ہے اور تمہارے کان پر جوں نہیں رنگ رہی۔ روزانہ اس کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی سے مرمر جاتی ہوں۔“

نیرا کا لہجہ بھرا رہا تھا۔ وہ بڑی کوشش کر رہی تھی آنسو مٹنے کی۔ کیا فائدہ کس بے حس اور بے درد انسان کے آگے کمزور پڑنے کا، اس طرح تو وہ اور شیر ہو گا۔

”مجھے بھی احساس ہے ان ضرورتوں کا، تمہارا کیا خیال ہے میں اطمینان سے بیٹھا ہوں اب گا کہ نہیں آ رہے، دکان نہیں چل رہی تو میں کیا کروں۔ میں تو اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں۔“

”میں چل رہی تو اسے چلانے کی تدبیریں سوچو۔“

اختیار میں اشتہار اور پوسٹر چھپوانے کے آس پاس کی مارکیٹ اور گھروں میں تقسیم کرواؤ۔ بچوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان ہے نہ نہ کرتے بھی خاصا منافع ہو جاتا ہے اگر بندہ طریقے سے کاروبار چلائے۔

تم نے صدیوں پرانا مال رکھا ہوا ہے اسے اس کی کمپنی کو واپس کر کے نیا اور فریش مال منگواؤ کسی دوسری مشہور کمپنی سے مال کی خریداری کی بات کرو۔ بچوں کے کپڑوں کی نئی ورائٹی، نئے ڈیزائن اور اشیاں کل لوگوں کو خود بخود متوجہ کریں گے۔ تم نے تھوڑا سا سوٹس دکان میں لٹکائے ہوئے ہیں جن کے رنگ اور کوالٹی بھی ناقص ہو چکی ہے ان پر ایک نظر ڈال کے کون خریداری کرے گا۔ کپڑوں کی نئی ورائٹی کے ساتھ ساتھ تم بچوں کی ضرورت اور دلچسپی کی دیگر چھوٹی موٹی اشیاء مثلاً جیومیٹری باکس، پینسلز، رنگ برنگے مارکرز، کلر باکس، ربڑ، شاہنرزا اور محدود تعداد میں خوبصورت سے کھلونے بھی رکھ سکتے ہو۔

ارسلان کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ نیرا کی باتیں اس کے دل کو لگ رہی ہیں۔
”ٹھیک کہتی ہو تم۔ میرا دھیان بھی ان باتوں کی طرف جاتا ہے مگر اشتہاری مہم، نئے مال کی خریداری اور دیگر چھوٹے موٹے آئٹمز شامل کرنے کے لیے سرمایہ چاہیے کم از کم بیس ہزار روپے اور یہاں تو یہ حال ہے کہ زہر کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔“

وہ بچن کے دروازے کے باہر کھڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔
”اگر یہ پیسے تمہیں مل جائیں تو۔۔۔“ وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”مل جائیں تو کاروبار چمک اٹھے گا اور ہماری روز روز کی لڑائیاں بھی ختم ہو جائیں گی، مگر یہ تو دل لگی ہے اتنے پیسے آئیں گے کہاں سے۔“

”آئے تو اس سے زیادہ تھے ارسلان۔“ اس نے لامتی نگاہ سے ارسلان کو دیکھا۔ ”تین لاکھ ملے تھے گھر کے حصے میں سے جنہیں تم نے ایک سال کے اندر اندر اڑا دیا۔ کیا ملا بیس ہزار روپے ماہانہ کرایے

والے عایدشان گھر میں رہ کر۔ آج اگر ایک ماہ کا کرایہ بھی بچا ہوا ہو تو یہ مسائل جنم نہ لیتے۔“
”اچھا چھوڑو، جو ہو گیا سو ہو گیا۔“ چچا تلوے کا احساس دبانے کے لیے اس نے نیرا کو ٹوکا تھا۔ ”میری شروع سے خواہش رہی تھی پوش سیکٹر کے کسی شاندار اسٹریکچر والے گھر میں رہنے کی۔“

”مگر تم نے اپنی خواہش غلط وقت پر پوری کی۔ وقت کا تقاضا تھا کہ ہم اس رقم کو نہایت احتیاط سے خرچ کر کے اپنا مستقبل محفوظ کر لیتے کوئی مناسب سا گھر دیکھ کر ایک پورشن کرائے پر لے لیتے۔ آئی ٹین آئی ٹائن میں ساڑھے چار پانچ ہزار تک کا بہت اچھا پورشن مل سکتا تھا۔ دو بندوں کا خرچہ ہی کیا تم میں ہزار کاروبار میں وسعت کے لیے خرچ کرنے کے بعد باقی ماندہ رقم قومی بچت اسکیم بینک میں جمع کروا سکتے تھے۔ ہر مہینے تھوڑا ہی سہی ایک مخصوص منافع باقاعدگی سے ملتا رہتا۔ آج ہم ایک خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوتے۔“

”ٹھیک کہتی ہو تم۔“ جانے کس جون میں تھا جو اپنی غلطی مان گیا۔ وگرنہ اس پر بھی بحث کرنا شروع کر دیتا۔

”اسی لیے کہتی ہوں ارسلان! جو غلطی ماضی میں ہو گئی اس کو دوبارہ دہرانا غلطی پر غلطی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اب دیکھو چھبیس تارخ کو تمہیں تقریباً تین ہزار کا منافع ہوا تھا، میں نے تمہیں کہا تھا کہ یہ پیسے فلیٹ کے کرایہ اور بجلی کے بل کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں مگر تم نے میری ایک نہ مانی، تمہارا کہنا تھا ابھی یکم آنے میں چار دن پڑے ہیں، تب تک اور آج میں گے اب تو کاروبار چل پڑا ہے میں کل ہی اتنے اور کمالوں گا۔ یہ کہتے ہوئے تم بھول گئے تھے کہ نوکری اور کاروبار میں فرق ہوتا ہے نوکری میں ایک مخصوص رقم ہر ماہ ہاتھ آجاتی ہے اسی حساب سے انسان اپنا بجٹ سیٹ کرتا ہے۔ مگر کاروبار میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں کسی دن ایک روپے کی کمائی نہیں ہوتی اور کسی روز ہزاروں کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ تم نے وہ تین

”میں نے کہا۔ ”وہی اس کا ہیوشہ کا قلعی اور جتنی لمبی تھی
”مجھے عورتوں کا جاب کرنا پسند نہیں ہے۔ ہر حال میں
ہے کہ جلد ہی حالات بہتر ہو جائیں گے۔“ وہ الہ
کھڑا ہوا۔

”میں چلتا ہوں یا رہ بج رہے ہیں آدمیوں تو انکل گیا۔“

”سنواری سلطان! میں اپنے زبورات کا ایک میسج دیتی ہوں، ہے تو پچیس ہزار کا، مگر بندہ فیصد سونا اور مزدوری نکالنے کے بعد بیس کا ہی بک سکے گا۔ تم یہ رقم کاروبار میں لگا دینا۔“

وہ اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے پہلے
ارسلان سخت خفا ہو گیا۔

”ہرگز نہیں“ اب کیا میں تمہارے زیورات بچ کر کھاؤں گا۔ اتنا بے غیرت سمجھا ہوا ہے تم نے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ اس نے سہولت سے سمجھایا۔

”زیور پڑا پڑا کون سا کام آ رہا ہے۔ یوں بھی مجھے ان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اچھا ہے کاروبار میں لگیں گے تو کام آئیں گے اور اگر تمہیں اتنا ہی ہے دو بارہ بنوا دینا میری پسند کے۔“

”پھر بھی میں زیورات بیچنے کے حق میں نہیں ہوں۔
یہ بڑی کمینگی کی بات ہے۔“ وہ متذبذب تھا۔
”چھوڑو ناں! جب میں کہہ رہی ہوں تو۔“

”تم بہت اچھی ہو۔ میں برداشت نصیب ہے۔
مجھے تم جیسی صابر اور برداشت والی بیوی ملی ہے۔
ارسلان نے تشکر بھرے انداز میں کہا۔

”بس لڑا کا طیارہ نہ بنی رہا کرو، باقی ہر خوبی کی
 ہو۔“ اس کے لہجے میں شرارت در آئی۔
 ”میں لڑائی شروع کرتی ہوں۔“ نیرا نے تیور
 چمڑھائیں۔

”نہ نہ تم کہاں شروع کرتی ہو بندہ پرور تم کو
صلح جو شیریں سخن اور عتیقہ دہن لڑکی ہو۔“
”اگر اس نے ہنس کر اس کی چھوٹی سی ٹاک دیاتی۔
”اول ہوں، میرا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔“ اس

ہزار تفریح کے نام پر چھٹی کر کے اگلے دن برابر کر لیے۔ رات کو جھانگیر ساڑھے چار سو کاؤنٹر کر لیا۔ صدر سے اپنے لیے نو سو کی پیٹ اور میرے لیے آٹھ سو کا سوٹ پیس لیا۔ کولڈ ڈرنک، آئس کریم، گول گے، چکن روٹ اور دیگر چیزوں پر مزید تین چار سو نکل گئے، دو تین سو بجے تھے جو کل میں نے مصالحو جات گئی اور چینی پتی کے لیے استعمال کر لیے۔ باقی کیا بچا خاک، اور گزشتہ مفتے سے تمہیں پچاس ساٹھ روپے سے زیادہ کی آمدنی نہیں ہوئی۔ اب کرایہ اور بجلی، گیس کے بل کے لیے رقم نہیں ہے۔" ارسلان چپ ہو گیا۔

ہو گیا۔
 ”خیر چنا مجھے بھی اچھا لگتا ہے ارسلان! میرا بھی دل
 چاہتا ہے سیو تفریح اور شاپنگ کے لیے، مگر ابھی
 ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم یہ عیاشی انورڈ
 کر سکیں۔ دوسروں کے واجبات ادا ہو جانے کے بعد
 ہی ذہنی سکون نصیب ہوتا ہے، ادائیگی کرنا ہو تو کھانے
 پینے کی عیاشی کر کے بندہ عجیب احساس جرم کا شکار
 ہو جاتا ہے کہ کاش یہ پیسے فلاں کام کے لیے بچا لیے
 ہوتے۔ دل پر جبر کرنا میرے لیے بھی آسان نہیں ہے
 میں نے تو آنکھ کھلتے ہی ہر چیز کی فروانی دیکھی تھی مگر
 اب حالات سے سمجھوتا تو کرنا ہے نا۔“
 ”صحیح کہتی ہو تم۔“ ارسلان کے لہجے میں شکستگی در
 آئی۔

”اگر میں جاب کر رہی ہوتی تو یہاں تک تو نوبت نہ آتی۔ خواہ مخواہ اس وقت ضد کر کے تم نے میری نوکری چھڑا دی۔ سات ہزار روپے تنخواہ تھی ایک سال سے کام کر رہی تھی۔ اگر شادی کے بعد بھی جاری رکھتی تو اب تک تنخواہ میں ڈیڑھ دو ہزار کا مزید اضافہ ہو چکا ہوتا۔ اتنا اچھا آفس تھا اس وقت تم نے ”تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ کہہ کر مجھے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ اب دوبارہ اتنی اچھی نوکری نہیں مل سکتی۔ ڈیڑھ برس ہو گیا چھوڑے ہوئے نئے بندے آگئے ہوں گے۔“ وہاں اسی سے بولی۔

”مہیں ضرورت بھی نہیں ہے دوبارہ جوائن

سے چھپ کر میل میلاپ کرتی ہوں گی۔ سولہ سنگھار بھی کرتی ہوں گی۔ ”ان“ کے لیے دوسرے رشتوں سے انکار کر کے من پسند رشتے کے انتظار میں وقت گزارتی ہوں گی۔ ہونہ سوچو ہے کھا کے ملی جج کو چلی۔“

اسے تو اب نیرا بھابھی بہت بری لگنے لگی تھیں، خواہ مخواہ امی کو عمر خان کے رشتے کے خلاف بدظن کرتی رہتی ہیں امی بھی تو اب دن رات نیرا آپا کی مثالیں دیتی رہتی تھیں۔ اب بھی وہ نیرا کے سامنے ہی شروع ہو گئیں تھیں۔

”دیکھ لو اپنی نیرا بھابھی کو اچھے بھلے خوشحال خاندان کی لڑکی تھی بہترے رشتے تھے مگر اس نے اپنی پسند سے کر کے اپنا آپ رول لیا۔ مالی وسائل کی تنگی ہو تو نہ دن کا چین نصیب ہوتا ہے نہ رات کا آرام ملتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ذہن سوچوں کی سولی پہ ٹنگا رہتا ہے۔ نہ اچھا کھانے کو نہ اچھا پہننے کو۔ بس سوچیں ہی سوچیں فکریں ہی فکریں۔“

”امی! عمر خان کی فیملی بہت امیر ہے۔ وہاں ایسی خرافات کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔“ وہ دل ہی دل میں نیرا بھابھی کو کوستی ہوئی، صفائی پیش کرنے لگی مگر وہ امی ہی کیا جو مان جائیں۔

”یہ بھی تو ایک مخالف نکتہ ہی ہوا ناں! ہم تو سیدھے سادے بڈل کلاس بندے ہیں۔ تم اکلوتی اولاد ہو اس لیے آسانی سے گزارا ہو جاتا ہے، وگرنہ ہمیں بھی بجٹ بنانے کے چکروں سے نجات نہ ملتی۔ وہ ٹھہرے اونچے طبقے کے لوگ جن کے خرچے ہوتے ہیں، دیکھا نہیں تھا اس کی ماں کیسے تیوریاں چڑھا کر رشتہ مانگنے آئی تھی۔“

”مگر آئیں تو تھیں ناں۔۔۔“ اس نے بحث کی۔ امی جل کر رہ گئیں۔

”کیا مطلب ہے،“ آئی تھی تو کیا ہم پر احسان کیا تھا، اپنے مطلب سے آئی تھی بلکہ صاف لگ رہا تھا زبردستی بھیجا گیا تھا۔“

”ایک تو عمر خان نے اتنی منت سماجت کر کے اپنی

میلے کہ وہ جھک کر مزید گستاخانہ کارروائی کرتا۔ اس نے شور مچاتے ہوئے اسے پرے دھکیلا۔



وہ نصیو آپا کو ساری روداد سن رہی تھی۔ ربیعہ بچن میں چائے بناتے ہوئے سن رہی تھی۔ ساتھ میں سوچ بھی رہی تھی۔

”تو نہ کیا ہوتا ایسا ویسا بندہ پسند ایسے لالچی اور نکمے بندے کا انتخاب کریں گی تو یہی ہو گا۔ بھلا عمر خان ایسے ہو سکتے ہیں، وہ تو جدی پستی دولت مند آدمی ہیں اور ارسلان بھائی انہیں تو بیوی سے ٹھیک طرح بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔ کیسے ہر وقت لڑتے جھگڑتے اور بے عزتی کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی نیرا بھابھی کہتی ہیں لاکھ خامیاں سہی ایک خوبی ایسی ہے جس کی وجہ سے میں ارسلان کے ساتھ تا عمر اسی کمپری کے ساتھ جینے کو تیار ہوں، وہ میرے ساتھ مخلص ہے، بے شک وہ غیر مستقل مزاج ہے۔ نکما ہے۔ غصہ ور ہے یا احساس نہ کرنے والا، مگر ہے تو سرتاپا میرا“ اس کے دل میں، میں ہی میں ہوں میرے علاوہ کوئی نہیں۔ عورت تو وفادار ہوتی ہی ہے۔ مرد میں وفانہانے اور بے دریغ پیار لٹانے کی خوبی ہو تو ازدواجی زندگی کا لمبا سفر عورت تہس کے پاپیادہ طے کر سکتی ہے۔“

جب سے نیرا نے عمر خان کے رشتے کی مخالفت میں نصیو آپا کو ووٹ دیا تھا، تب سے وہ ربیعہ کی ناپسندیدہ شخصیات کی لسٹ میں ثابت آپچی تھی۔

”عجیب دو غلی فطرت کی مالک ہوتی ہیں یہ عورتیں، خود عشق و عاشقی میں بڑ کے ماں باپ کی مخالفت کے باوجود پسند کی شادی کر لیتی ہیں اور جب اپنی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے تو اپنے نقش قدم پر چلنے والی دوسری لڑکیوں کو لعن طعن کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایسے پاک باز اور صاف شفاف بن جاتی ہیں جیسے خود تو محبت کے لیے بغاوت کی ہی نہ ہو۔ خود بھی تو اسی طرح ماں باپ سے چھپ کر خفیہ ملاقاتیں کرتی ہوں گی۔ آپس میں رابطے کے لیے خط یا فون کا سہارا لیتی ہوں گی۔ سب

مما کو منا کر ہمارے گھر بھیجا تھا اوپر سے آپ۔" وہ ہلکا کر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"میں کیا۔ ہاں ہاں کہہ دوں ناں! اوپر سے میں نخرے دکھا رہی ہوں۔" اماں کے تیسرے لگی اور تلووں پہ بجھی۔

"میں دیکھ رہی ہوں جب سے اس کی ماں چکر لگا کر گئی ہے تمہاری زبان کچھ زیادہ ہی کھل گئی ہے۔ اس کی خاطر ماں سے بد تمیزی کر رہی ہو تم۔"

"بد تمیزی کی کیا بات ہے میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں۔ کہ جب عمر خان کی والدہ عزت سے گھر آکر آپ سے رشتہ مانگ چکی ہیں تو پھر آپ کس بات کی ضد لگائے بیٹھی ہیں۔"

درخواست کو بے اثر سمجھتے ہوئے بالآخر وہ دوبارہ سوال جواب پر اتر آئی۔ نصیوہ آپا ہکا بکا بیٹی کی صورت دیکھنے کے بعد اب نیرا کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے تھیں۔

"دیکھ رہی ہو نیرا! اس کا لہجہ جیسے اپنی ماں سے نہیں دشمن سے بات کر رہی ہو۔" کلیجہ دکھ سے چھلنی ہو گیا تھا۔

"آپ بھی تو محبت کے بجائے مخالفت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔" وہ اکل کھرے انداز میں بولی۔ "بیٹی کی رائے کے بجائے ایرے غیروں کی آراء کا آپ کو زیادہ خیال ہے۔" اس نے نیرا پر چوٹ کی تھی۔

"خبردار! جو نیرا سے بد تمیزی کی۔ تم سے بڑی ہے وہ اور میری جی ہمدرد بھی ہے۔" اماں نے خونخوار نظروں سے اسے کھورا تھا۔

نیرا کو بری طرح اپنی سبکی محسوس ہوئی۔ ماں کے ساتھ ساتھ وہ گھر آئے مہمان سے بھی کھلم کھلا بد لفاظی کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر نیرا اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔

عشق و محبت کی آگ لڑکیوں سے ساری تمیز و تہذیب چھین کر انہیں بے پاک اور بد زبان بنادیتی ہے۔ وہ اپنی فطری حیا اور نسوانی لحاظ و وقار بھلا کر مقابلے پہ آجاتی ہیں۔

"مجھے نہیں پتا میں نے ایک بات بتادی ہے مثلاً ہوگی تو صرف عمر خان سے۔ مجھے آپ کی پسند پر قبضہ نہیں ہونا۔ میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے وہ زندگی تو صرف ایک بار ملتی ہے اور میں اس کو آپ کی پسند سے ایرے غیرے کے نام لگا کر برباد نہیں کرنا چاہتی میں اسے اپنی پسند سے جیوں گی۔ اپنی پسندیدہ ہستی کے ہمراہ۔"

اس کے لہجے سے انداز میں اور پاکستانی فلموں کا اثر واضح محسوس کیا جاسکتا تھا۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں نیرا بیٹی۔" رنجیدہ لہجے پر پختی وہاں سے جا چکی تھی۔

"آپا! آپ مان لیں اس کی بات۔" نیرا نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ بے چاری مجبور و لاچار ماں۔

"کیسے مان لوں نیرا! ڈیڑھ ماہ پہلے اس کی ماں آئی تھی۔ غرور و ناز اور تکبر کی گٹھڑی اٹھا کر بمشکل دس پندرہ منٹ کو بیٹھی ہوگی۔ چلتے سے اس نے بیٹے کا رشتہ یوں دیا جیسے کوئی ایک روپے کا سکہ خیرات میں پھینکتا ہے۔ وہ بھی بادل خواستہ نہ لہجے میں کوئی طلبا چاہ تھی نہ انداز میں خلوص عیوں لگ رہا تھا بیٹے کی منہ پر کڑوا گھونٹ بھر رہی ہو۔"

اماں نے جلے دل کے پھپھو لے پھوڑے تھے "میرے بیٹے کو یونیورسٹی میں آپ کی لڑکی پسند آئی ہے۔ میں اس کا رشتہ لے کر آئی ہوں۔ کیسے۔ میں کس ڈیٹ کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے آؤں۔ منگنی کے ٹھیک ایک ماہ بعد شادی ہوگی۔"

نصیوہ آپا عمر خان کی ماں کے لہجے کی نقل اتارنے ہوئے بتا رہی تھیں۔

"وہ تو مانو یوں بول رہی تھی گویا وہ صاحب اختیار ہے اور میں اس کی تابعدار ملازمہ۔ میرے تو تلووں پہ لگی سریر بجھی میں نے صاف کہہ دیا بہن اول تو مجھے اپنی بیٹی کی شادی کی اتنی جلدی نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کے لیے اور بھی رشتے آئے ہیں میں دیکھ کر کرا سوچ سمجھ کر اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی کا فیصلہ کرنا

گی۔" "یہ تو بہت غلط طریقہ ہے رشتہ مانگنے کا گویا لڑکی نہیں دو روپے کی چیز مانگنے آئی ہوں۔" "نیرا کو بھی افسوس ہوا۔

"اور بھی تو سنو۔ اس لونڈے کے بہکاوے میں آکر یہ اس دن کے بعد سے مجھ سے سدھے منہ بات نہیں کر رہی۔ بھلا کس لیے۔ اس لیے کہ بقول اس کے عمر خان کی ماں کو میرا جواب سخت ناگوار گزرا ہے۔ میں نے اس طرح کا جواب دے کر ان کی انسٹلش کی ہے۔" وہ دانت پیس کر بولیں۔

"گویا مجھے تو ان کی آمد کو ہی غنیمت جانتے ہوئے فوراً ہائی بھر کے شادی کی تاریخ دے دینی چاہیے تھی۔ اس کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا۔ کہ وہ خود چل گئے رشتہ مانگنے آگئی تھیں۔" وہ سخت دلبرداشتہ تھیں۔ "جس اولاد کی تربیت کے لیے اپنا تن من وارا اپنا آپ بھلا کر جس کے سکھ کے دنوں کے لیے ہم نے دھوپ کے موسم کاٹے، آج وہ بے حیا بن کے کہتی ہے آپ نے میرا معاملہ بگاڑ کر "پراہلم" کھڑی کی ہے۔ عمر خان کہتا ہے مما اتنی مشکل سے راضی ہو میں تھیں گھر آنے پر مگر آنٹی نے "مس لی ہو" کر کے ان کو ذلیل کیا ہے اب آنٹی کو خود چل کر نما کے پاس آنا چاہیے، رشتے کی منظوری دینے ورنہ ان کی طرف سے بات ختم سمجھیں۔"

نصیو آبا بیٹی کی کئی گئی باتیں چبا چبا کر اگل رہی تھیں۔

"ہائیں۔" "نیرا کامنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"حد ہو گئی بھئی۔ رشتہ مانگنے کے بعد دوبارہ جواب لینے آنا تو لڑکے والوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ کون سا انوکھا رواج نکال رہی ہیں۔ کیا بیٹی کی ماں کی یہی عزت و توقیر رہ گئی ہے کہ وہ خود لڑکے والوں کے گھر جا جا کر اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرتی پھرے۔"

"تم سمجھیں نہیں، نیرا رواج نکالنے کی بات نہیں۔ مقصد صرف ہمیں ذلیل و خوار کرنا ہے، ہمیں کمتری، حقارت اور بے وقعتی کا احساس دلانا ہے اور شرم کی

کہ میں لڑکے کے گھر جا کر اس کی ماں کے حضور رشتہ کی منظوری کی ہائی بھروں۔ یہ بات مجھے قیامت تک منظور نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے میں اس رشتہ سے صاف صاف انکار کروں گی۔"

"ربیعہ! پاگل تو نہیں ہو گئی۔" نیرا نے اپنا سر تھم لیا تھا۔

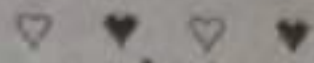
"یہ کیوں خود کو اتنا گرا رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں بات کیوں نہیں آرہی کہ رشتہ وہی ہوتا ہے جو چاہت خلوص اور احترام کے تمام تر تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جوڑا جائے۔ یہ تو خود اس کی اپنی تذلیل ہے اور وہ لڑکا۔ اس کا تو مطلب ہے وہ اسے ٹیک فور گرائنڈ کے طور پر بڑے حق اور شان کے ساتھ قبول کر رہا ہے۔ احساس برتری کے ساتھ جو بھی رشتہ بنایا جائے وہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ ابھی سے ماں بیٹے کی ناک اتنی لمبی ہے تو بعد میں تو اسے مٹی میں رول دیں گے۔ بے شک میں نے اپنی پسند سے شادی کی مگر اس میں ارسلان کے گھر والوں کی بھی پوری مرضی، چاہت اور شوق شامل تھا۔ اس کی مرحومہ ماں اور بھائی بھابھیاں بڑی خوش دلی سے رشتہ لے کر آئے تھے، انہیں کئی بار چکر لگوانے کے بعد بالآخر بابا جان نے ہاں کی تھی۔" نیرا بول رہی تھی اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ربیعہ کے اندر رہا نبھڑھلتے جا رہے تھے۔

"ہو نہہ! میرے ساتھ تو یوں ہوا تھا تو میرے ساتھ دوں ہوا تھا۔ کیوں آتی ہے یہ عورت، میرے معاملے میں بڑی آئی اپنی رائے کا اظہار کر کے فیصلہ سنانے والی، بھئی! تمہیں کیا، تم اپنے کام سے کام رکھو بڑی بی نہ ہو تو۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے مجھے اس درجہ مغرور شکیر اور ناک نخرے والے گھرانے میں رشتہ نہیں کرنا۔ سوچ رہی ہوں کل یا سر کی ماں کو بلوا کے ہاں کروں۔ بچاری پچھلے دو سالوں سے میرا جواب لینے کے لیے گھر کے چکر کاٹ رہی ہے۔ کرتی ہوں آج لاہور فون۔" وہ کیا جانتی تھیں ہر کئی ہوئی بات پوری نہیں ہوتی

تھا اس کی کٹناخی خطرناک حد عبور کر چکی تھی۔

اور یہ کہ کوئی فیصلہ آخری نہیں ہوا کرتا۔



اس نے ایسا ہنگامہ مچایا تھا کہ نصیو جیسی سمجھ دار اور معاملہ فہم خاتون بھی دنگ رہ گئی تھیں۔
”اے میں نے آپ کو صاف لفظوں میں بتادیا ہے کہ میں آپ کے تجویز کردہ انتخاب کو رد کرتی ہوں“
مجھے یاسر سے نہیں عمر خان سے شادی کرنی ہے۔ اور اس کے لیے آپ کو عمر خان کے گھر جا کر اس کی ممانعت سے رشتے کی بات کرنا ہوگی۔“

”لعنت ہے مجھ پر اگر میں اپنی عزت نیلام کر کے خود بی بی کا رشتہ لے کر اس بد دماغ عورت کے پاس جاؤں تو نصیو غرائیں۔“

”تمہارے تو دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے جو اس لونڈے کی تال پہ ناچ رہی ہو۔ وہ دن کو دن کہے تو تم کہو دن اور رات کہے تو۔۔۔“

”بس بس“ نہیں برا بھلا کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے مروتی سے بولی۔

”اور ماں۔۔۔!! تمہاری ماں کو کوئی جیسے مرضی ذلیل کرے وہ قبول ہے؟“ انہوں نے ملا متی نظروں سے سوال کیا۔

”اس میں ذلت کی کیا بات ہے۔“ اس کے ماتھے پر شکنیں نمایاں تھیں۔

”کون سا نیا کام کرنے جا رہی ہیں۔ ہمارے اسلام میں بھی تو ایسی مثالیں ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ کئی ممالک میں لڑکی والے رشتہ لے کر گھر جاتے ہیں۔“

”واہ رے انسان! اپنے مطلب کے لیے مذہب دنیا لوگ جانے کہاں کہاں سے مثالیں کھینچ لاتا ہے۔“ تیرا کے قدم دبلیں رہی رک گئے تھے۔

”تم اپنے گھنیا فیئر میں محترم و مقدس ہستیوں کی مثال بیچ میں مت لاؤ“ تف ہے تم جیسی اولاد پر اس سے تو میں بے اولاد ہی اچھی تھی۔“ نصیو کے دل میں تیرا کھباتھا۔

”اب تو پیدا ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ پہلے سوچنا

”تواندھی ہو گئی ہے اس مکار اور دھوکے باز لڑکے کے پیچھے یاد رکھ بہت پیچھتائے گی اگر اپنی من مانی کی تو۔ وہ امیر بھی ہے اور خوبصورت بھی اور خود تو اپنے آپ کو دیکھ نڈل کلاس گھرانے کی ایک قبول صورت لڑکی۔ وہ وقتی جذباتیت کے تحت تجھے اپنا تولے گا مگر نبھانہ سکے گا۔ جو ماں کے آگے تیرے واسطے ابھی سے بے بسی اور خاموشی کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ تجھے بیوی بنا کر اس گھر میں عزت اور مقام کیسے دلوائے گا جہاں تک مجھے اندازہ ہے وہ مکمل طور پر ماں کے زیر اثر ہے۔ اور اس کی ماں تو تجھے جیسی کو کچا چبا کر کھار بھی نہ لے۔“
جب وہ بہت غصے میں آتی تھیں تو اندازِ مخاطب بھی بدل جاتا تھا۔

”پاؤں کی جوتی بن کر ہر کسی کے قدموں تلے روندی جائے گی۔ وہ ماں بیٹا تیرا جینا عذاب بنادیں گے۔ مرد خوبصورت اور مال دار ہو تو اسے ہر روز ایک سے ایک نئی طرح وار لڑکی لفٹ کرانے کو تیار رہتی ہے تو کس کھاتے میں ہے۔“

وہ اسے کھری کھری سنار ہی تھیں اس کی حیثیت و اہمیت واضح کر رہی تھیں مگر سنتا تو وہ جس کی بصارت اور سماعت سلامت ہوتی۔ اس کی آنکھ پر پٹی اور کان پر پردے پڑ گئے تھے۔

ماں بہتیرا سمجھاتی رہی مگر اس کے کان پر جوں نہ رہینگے۔

”ذرا اپنی قدر پہچانو۔ اپنی عزت کا خیال کرو۔ رشتہ اچھا ہوتا اور وہ لوگ عزت و احترام سے چاہت سے تمہیں مانگنے آتے تو میں اس رشتے پر ضرور غور کرتی مگر اس صورت میں ناممکن ہے، قطعی ناممکن! میں مر بھی جاؤں تو بھی وہاں جا کر تمہیں ان کی جھولی میں ڈالنے کا شرمناک کام نہیں کروں گی۔ تو بہ استغفار! کیا کہوں جا کر کہ میری بے شرم بیٹی آپ کے بیٹے کے عشق میں اس درجہ مبتلا ہے کہ خود ماں کو رشتہ لینے بھیجا ہے۔“
”آپ کیا، خود میں مرجاتی ہوں۔“ وہ ہنسیائی کیفیت کا شکار ہو گئی۔

”میری وجہ سے آپ کی زندگی عذاب ہے۔ میں ہوں ناں ہر فساد ہر مصیبت کی جڑ میری وجہ سے آپ کی عزت پہ حرف آئے گا۔ میں بچاتی ہوں آپ کی عزت۔“ وہ باؤلی ہو رہی تھی۔ اسی دھن میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پہ چلی گئی۔
”اس جوگی بھی نہیں ہو تم! بے غیرت اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔“ نصیو نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔
نیرا جوا اتنی دیر سے خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھی ایک دم آگے بڑھی تھی۔
”آپ! اس کو دیکھیں شاید چھت سے کود رہی ہے۔“

وہ ہر اسال ہو کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
”رہنے دو ہوس اور غرض کے بندے سدا کے بزدل ہوتے ہیں۔ ایسے کمزور دلوں سے بہادری کی کوئی توقع۔“
وہ اوپر سے تو سنگ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھیں مگر اندر ہی اندر ان کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ کچھ تذبذب کے بعد وہ بھی نیرا کے پیچھے چلی گئیں۔
اوپر ایک روح فرسا منظر ان کا منتظر تھا۔
وہ چھت کی ریلنگ پر دو سری طرف لٹکی ہوئی تھی اور نیرا نے مضبوطی سے اس کا بازو تھاما ہوا تھا۔
”چھوڑو مجھے، مرجانے دو مجھے۔“ وہ چلا رہی تھی ساتھ ساتھ اپنا آپ چھڑا رہی تھی۔
”ربیعہ ربیعہ ہوش کرو ربیعہ۔!“ نیرا پھولی سانس کے ساتھ سمجھا رہی تھی۔

”چھوڑو میری خوشیوں کی راہ میں پتھر بننے والی مکار۔ تمہاری پڑھائی ہوئی پیوں نے ہی میری ماں کو بیٹی کا دشمن بنایا ہے۔“ وہ بھڑک رہی تھی۔
نیرا کے حواس سن ہو گئے۔ وہ صرف اس کی موجودہ کیفیت کی وجہ سے خاموش ہو گئی تھی ورنہ دل چاہ رہا تھا ایک گھما کے لگائے۔
نصیو آپا نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔
”دنیا کو تماشا نہ دکھاؤ ربیعہ! تمہیں اللہ رسول کا

”نصیو مجھے نہیں آپ کو چھوڑنی ہوگی۔ آج فیصلہ ہو کے رہے گا۔ یا آپ میری بات مان لیں گی یا پھر میں اپنا جان سے جاؤں گی۔“
وہ سرکشی سے بولی۔ اونچائی اتنی تھی کہ گر کر مرنا لازمی تھا۔

”لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں ربیعہ! خدا کے لیے اپنے مرحوم باپ کی عزت کا خیال کرو۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ انہوں نے منت کی۔
”مجھے کچھ نہیں پتا۔“ وہ ضدی اور خود سر انداز میں بولی۔

”اچھا پھر میری بھی ایک شرط سن لو۔“ معا نصیو آیا کا چہرہ پر اسرار قسم کے سرد اور پتھریلے تاثرات سے سج گیا۔
”اگر تم نے عمر خان سے شادی کرنی ہے تو پھر مجھے چھوڑنا ہوگا۔ صرف اسی صورت میں تم اسے پاس کر سکتی ہو۔“

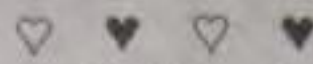
”میں آپ کی اس ایموشنل بلیک میلنگ کا شکار نہیں بنوں گی۔“ وہ چیخ کر بولی۔
”میں عمر خان کو کسی قیمت پر نہیں گنوا سکتی۔ وہی میرا سب کچھ ہے اس کے علاوہ کوئی میرا اپنا نہیں ہے۔“ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔
”میں بھی نہیں ہوں۔!“ نصیو نے بہت سہل انداز میں سوال کیا۔

”نہیں ہیں کوئی نہیں ہے میرا اس دنیا میں سوائے عمر خان کے۔“ وہ جنونی ہو رہی تھی۔
نصیو کا چہرہ بجھ گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ اچانک کسی فیصلے پر پہنچ گئیں۔
”میں تمہاری ضد پوری کرنے کے لیے عمر خان کی والدہ سے ملنے ان کے گھر جاؤں گی اور تمہارے رشتے کی بات بھی کروں گی۔ تمہاری مرضی کا سارا جینز بھی تمہیں مل جائے گا۔ تم اسی گھر سے رخصت ہوئی ہو اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان درو دیوار اور ہل

کے رہنے والوں سے تمہارا ناتا ٹوٹ جائے گا۔ تم دوبارہ
بھی یہاں نہیں آؤ گی۔ تاہم مجھے اپنی شکل نہیں دکھاؤ
گی۔
ان کے احساسات جیسے برف کا ایک تودہ بن گئے
تھے۔

”منظور ہے۔“ جانے وہ پاگل پن، خبط اور جنون و
عشق کی کون سی گھڑی تھی کہ ماں کی ممتا کی چھایا چھوڑ
کر اس نے عمر بھر کے لیے دھوپ میں اگے بے سایہ
شجر کا انتخاب کر لیا تھا۔
نیرا تحیر کا مجسمہ بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔



اپنی شادی کی شاپنگ اس نے ماں کے سرد و سیاٹ
لا تعلق رویے سے قطع نظر بڑے دل سے خوشی خوشی
کی تھی۔ بلکہ کافی ساری شاپنگ تو اس نے عمر خان کے
ہمراہ اس کی نئے ماڈل کی ہنڈ اسوک میں بیٹھ کر کی تھی۔
ماں نے ایک بار صرف ایک بار کہا تھا۔
”تمہیں جو کچھ خریدنا ہے نیرا کے ساتھ جا کر اپنی
مرضی کا خرید لو۔ فریجیر اور الیکٹرونک کے سامان کے
متعلق اپنی پسندار سلمان کو بتا دو۔ وہ لے آئے گا۔“
”جی نہیں“ مجھے ایرے غیرے کا احسان نہیں
چاہیے۔“

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ماں کے لیے نیرا کی کیا اہمیت
اور چاہت ہے اس نے بے دھڑک کہہ ڈالا تھا۔ ”میں
سب کچھ خود اپنی پسند سے خرید لوں گی۔“ پھر نصیوہ نے
دوبارہ کچھ نہیں کہا۔

شادی میں انہوں نے بہت محدود مہمان بلائے
تھے۔ اپنے مرحوم شوہر کے قریبی عزیز اور رفقاء اور نیرا
اور ارسلان۔۔۔ کل بیس یا بیس افراد تھے۔ قریبی
ہوٹل کی بکنگ اور ہال کا انتظام ارسلان نے سنبھال لیا
تھا۔

شادی کی دیگر لمبی چوڑی رسومات بھی ادا نہیں کی
گئیں صرف ربیعہ کے اصرار پر شادی سے ایک دن
پہلے کی رات کو مہندی کا مختصر سا فنکشن رکھا گیا تھا
جس میں نصیوہ آپا کے اصرار پر نیرا بھی شریک ہوئی

وہ مہندی پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ہفتے کا
دن تھا ارسلان شام آٹھ بجے گھر پہنچ گیا تھا۔ اگلے دن
چھٹی تھی لہذا ہفتے کی رات وہ خوب زور و شور سے
سیلبرٹ کیا کرتا تھا۔ گھر آیا تو نیرا کی تیاری آخری
مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ کپڑے، ہیرا سناگل
میک اپ کے بعد۔۔۔ چنگ چپل جینز کی جوتیوں میں سے
تلاش کی جا رہی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی“ اتنا ج سنور کے تباہی بن کر تم
میری ویک اینڈ ٹائٹ برباد کرنے پا رہی جا رہی ہو۔“
ارسلان کے ارمانوں پر اس بڑ گئی تھی۔

ملنی کلرز کے دھاتوں کی گڑھائی والے ہلکے نفیس
گلابی شیٹون چارجٹ کے سوٹ میں وہ لگ بھی
زبردست رہی تھی۔ گلابی چمک دیتے اسٹون کے
ٹاپس نیکلس میں وہ بڑی فٹ لگ رہی تھی۔ ایک
ہاتھ میں گلابی شیشے کی ڈھیروں چوڑیاں دوسرے میں
سونے کے دو کننگن اور اسی ہاتھ میں سونے کی تین
نفیس انگوٹھیاں ارسلان کا پسندیدہ پرفیوم۔

بلاشبہ اس کی ہوش ربانی میں کوئی کسریاتی نہ رہی
تھی۔

”مجبوری ہے بھئی! سات بجے کا کہا تھا نصیوہ آپا نے
ساڑھے آٹھ ہونے کو ہیں۔“ اونچی ایری کی ہلکے فان
کلر کی چپل پہن کر اس نے اپنا سر اپا آئینے میں چیک
کیا۔

پیچھے کھڑا ارسلان بے خود ہو رہا تھا۔
”ماشا اللہ“ چشم بد دور۔۔۔ میں تو نہیں جانے دوں گا
تمہیں۔“ نیرا نے ارسلان کے ارادے خطرناک دیکھے
تو بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔



ربیعہ کی شادی کو چھ ماہ گزر گئے تھے، معاہدے کے
مطابق نہ وہ گھر آئی اور نہ نصیوہ آپا نے اس کے گھر میں
قدم رکھا۔

ربیعہ کی شادی کے بعد نیرا باقاعدگی سے ان کے ہاں
چکر لگایا کرتی تھی وہ جانتی تھی کہ بیٹی کے جانے کے بعد

”تو کیسی ہیں تیرا بھابھی! اور تو اور کونسا احمد
میری امی کیسی ہیں؟“

کیا کچھ نہ تھا اس کے لیے میں۔

جنگلی، بے قراری، محرومی، ملنے کی حسرت، دوری
کی تڑپ، ہار۔ مکمل ہار
اس کا انگ انگ بول رہا تھا۔

پورا سراپا گواہی دے رہا تھا کہ عمروں کے تجربے کے
آگے ناپختہ عمر کی جذباتی سوچ کو ہارنا ہی تھا اور وہ ہار گئی
—

اب کے ہر سو وہ اواسی ہے کہ دل کہتا ہے
کوئی بھٹکا ہوا راہرو ہی سفر میں اترے
کوئی روٹھا ہوا جنگلو ہی بلائے مجھ کو
کوئی ٹوٹا ہوا تارا میرے گھر میں اترے
وہ خاموش لبوں سے کہہ رہی تھی اور نیرا بھی
خاموشی کی زبان میں اس سے مخاطب تھی۔

”نادان لڑکی! کہا نہیں تھا جس آستانے پر چھاؤں
اور پانی نہ ہو وہاں ڈیرے نہیں ڈالتے۔ جس مٹی میں
ریت ملی ہو اس میں بیج نہیں بوتے۔ جس دریا میں پانی
سوکھ جائے وہاں کستی نہیں ڈالا کرتے۔ بھلا ہوا کا
جھونکا بھی کبھی مٹھی میں آیا ہے۔“

”نصیرو آپا اچھی ہیں۔“ نیرا نے ہمدردی سے اس کو دیکھا۔

”وہ تو ہمیشہ سے بہت اچھی تھیں بھابھی! براتوں کے ساتھ میں نے کیا۔“ ربیعہ کی بھیگتی آنکھوں میں ملال اور پچھتاوے کا چمکتا بیانی صاف دیکھا جاسکتا تھا۔

”میں نے بہت کشت اٹھایا ہے ان کی نافرمانی

کر کے، ان کے مقام کو بھلا کر میں تو خود بے نشان و بے وقعت ہو کر رہ گئی۔ ”وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ریلیکس رہیو! یہ پبلک پلیس ہے“ چلو کسی
ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

نہتا الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ کر ریحہ اپنی شکست اور بربادی کی کہانی سناتے لگی۔

عمر خان کو بس وہ پسند تھی، کوئی طوفانی محبت بھی نہ تھی کہ دل لگی، دل کی لگی بن جاتی مگر ریچہ کو یہی خوش

وہ بہت اکیلی سی ہو گئی تھیں۔ اس تمام عرصے میں نیرا نے ان کی زبان سے ربیچہ کے متعلق کوئی بات نہیں سنی بلکہ نیرا کو بھی منع کر دیا تھا کہ اس کا ذکر نہ کیا کرے، خواہ مخواہ زخموں کے ٹانگے اکٹرنے لگتے ہیں۔

خواتین اور بچوں کے ہاں ہرگز نہیں تھے۔
نیرا کے گھر کی حالت خاصے بہتر ہو گئے تھے۔
زبورات کا سیٹ بیچ کر جو رقم کاروبار کی وسعت کے
لیے لگائی اس کے خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ کام
چلتے بلکہ بڑھتے دیکھ کر خود بخود ارسلان کی دلچسپی اور
دھیان بھی بڑھتا چلا گیا۔ وہ باقاعدگی سے دکان پر بیٹھنے
لگا۔ اب وہ پوری بنجیدگی اور تن دہی سے اپنے کاروبار
میں مگن ہو گیا تھا۔ معاشی بوجھ کم ہوا تو خود بخود لڑائی
جھگڑے بھی کم ہوتے چلے گئے اور دل تو ان کے کسی
حال میں بھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوتے تھے۔
اس دن نیرا آنے والے ننھے مہمان کے لیے کچھ
چیزیں خریدنے گئی ہوئی تھی۔ ڈسکاؤنٹ شاپ سے
نکلے ہوئے وہ میسرور لوہی جوتاں دیکھنے لگی۔

”نیرا بھابھی۔“ دکان سے یاہر نکلتی ربیچہ کے قدم وہیں پہنچ گئے تھے۔ نیرا جو اپنے دھیان میں ڈیرا لے کر دیکھنے میں محو تھی آواز پر چونک سی گئی۔

آج پورے سات ماہ بعد اس نے ربیعہ کو دیکھا تھا۔
 ”اوہ مائی گاڈ۔“ اور سات ماہ میں وہ کیسی ہو گئی تھی۔
 صحت مند، جوان، تروتازہ گندمی رنگت کی ساری
 سرخی، خچر کر زروی میں ڈھل گئی تھی۔

گو کہ اس نے بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا، کم از کم گیارہ سو کے سینڈل پاؤں میں تھے، اتنے کا ہی شولڈر بیگ ہو گا۔

ہاتھوں میں کھائی بھر بھر سونے کی چوڑیاں، گلے میں
مونی گولڈن چین، ہیرے کی دو انگلیٹھیاں۔ چار قدم کے
فاصلے پر ہنڈا سوک میں باوردی ڈرائیور مگر ان تمام
لوازمات کے باوجود وہ بے انتہا کملائی ہوئی اور شکستہ
دکھائی دے رہی تھی۔

”کیا حال ہے ربیعہ؟“ میرا نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سابقہ مکالمات و واقعات کو بھلا کر مزاج پر سی کی۔

مٹی لے ڈالی۔ وہ شہری چمکتے روپے الفاظ وہ جذبات
کی وہالہ تڑپائی اور مرمت کے دعوے۔

وہ ان سب کو محبت کی معراج سمجھ بیٹھی۔
خود عمر خان نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ ماں کو رشتے کے
لے بھیج دیا ہے اور اسی پر وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ اس
کم کو بہت زیادہ جان کر جواب میں وہ اس سے بہت
زیادہ کرتا چاہتی تھی۔ اس نے ماں کو ذلیل کرانے عمر
خان کے گھر بھیجا تھا۔ اس کی خاطر اپنا سیکہ اور اپنی
ماں کو ہمیشہ کے لیے خیر یاد کہہ دیا تھا۔ یہی بات شادی
کے بعد عمر کی ممانے سب سے پہلے جتنائی۔

”سوچا تھا کہ جان چھٹ جائے گی اس طرح“ اسی
لے خود چل کر ہمارے ہاں آکر رشتہ مانگنے کی تیغ لگائی
تھی۔ میرا خیال تھا اس حیلے سے میں بھی اپنے بیٹے
کے سامنے سچی ہو جاؤں گی اور تمہارے ساتھ رشتہ
بھی نہ ہو سکے گا مگر تم لوگ تو بہت بیچ اور ہلکے نکلے خود
چل کر ماں بیٹی کا رشتہ دینے آگئی۔ بہت خوب۔“

اور جب بعد میں انہیں بتا چلا کہ ماں نے ہمیشہ کے
لے گھر سے رخصت کر دیا ہے تو ایک اور فسانہ ہاتھ
آگیا۔

”تم جیسی بے غیرت اور بے شرم بیٹیاں اللہ کسی کو
نہ دے۔ ایسی کیا آگ لگی تھی جو ماں کو رشتہ لینے بھیج
دیا۔ اچھے گھر کے لڑکوں کو پھانسا تم جیسے لوڑ مل
گھرانوں کی لڑکیوں کا مشغلہ ہوتا ہے“ اسی کام کے لیے
کلج یونیورسٹی آتی ہو۔“

پھر تو جیسے ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔
وہ زبردستی کی ہو تھی اور ہو بھی ایسی حسین و جمیل
طرح دار، سوسائٹی موون کلچر خاتون کی، انہوں نے گویا
اسے ٹھوکروں پہ رکھ لیا تھا۔ ہر بات ہر کام اور ہر ادب
تقید، کمتری کا احساس دلانا خواجواہ کا رعب جما کر طنز
کر کے بزل کرنا۔ تحقیر سے پیش آنا، نوکروں کے
سامنے ذلیل کرنے سے بھی گریز نہ کرنا اور گھر کے کسی
بھی معاملے یا مسئلے میں اس کی ذات اور حیثیت کو
پوری طرح نظر انداز کرنا۔

عمر خان تو اس مسئلے میں مکمل طور پر ایک طرف

ہو گیا تھا۔ اس کی ممانت کرنے یا حیثیت دلانے کے
وعدے گویا نازک خواب تھے جسے اس نے ہاتھ سے
پرے کر کے توڑ دیا تھا، وہ ممانت کی کسی بات میں دخل
نہیں دیتا تھا بلکہ ان کے کہنے یا توجہ دلانے پر خود بھی
اس کی اوقات یاد دلایا کرتا تھا۔ یوں بھی وہ لایالی اور
کھلنڈرے مزاج کا بندہ تھا۔ یونیورسٹی میں وقتی طور پر
وہ اچھی لگ گئی تو گھر میں بسالیا۔ اب ممانت کے کہنے پر
جب باقاعدگی سے کلب جانا شروع کیا تو ایک سے ایک
حسین تنلی نے اس کا استقبال کیا اتنا حسن دیکھا کہ
گزارے لائق شکل والی ربیعہ بالکل ہی دل سے اتر
گئی۔

شروع کا ایک ڈیڑھ ماہ کا عرصہ پھر بھی بہتر گزرا تھا
اس کے بعد تو گویا وہ عمر خان کے گھر میں پڑی ایک بے
کار اور فالتو چیز بن گئی تھی جس پر ممانت لگے ہوئے اپنے
طنز اور تحقیر و تذلیل کی گرد ڈال دیا کرتیں اور عمر خان کو
تو اتنا بھی گوارا نہیں تھا، اگر وہ سابقہ باتوں، خوابوں اور
ملاقاتوں کا تذکرہ چھیڑتی تو وہ انہیں اپنی اسٹوڈنٹ
لائف کی نادانی، بے وقوفی اور بھول کہہ کر کرے سے
ہی چلا جاتا۔

اس نے تو سانپ کی طرح کینچلی ہی بدل ڈالی تھی۔
چند روز کھیل کے پھول کی خوشبو چرا کر وہ نئے جہان
دریافت کرنے آسمانوں کی سیر کرنے چل پڑا تھا۔ وہ اپنی
قریبانی یاد دلاتی تو کہتا۔

”یہ تو تمہارا اپنا فیصلہ تھا تم ہی مرتی تھیں مجھ پر،
میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ ٹھیک ہے میں تمہیں
پسند کرتا تھا مگر شادی کافی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا پتا
نہیں کس جھونک میں شادی ہو بھی گئی ورنہ میرا بھی
موڈ نہیں تھا اگر تم اپنی ماں کو نہ بھیجتیں تو شاید اب تک
میں تمہارا نام تک بھول چکا ہوتا۔ میں ایسا ہی ہوں۔“
وہ کندھے اچکا کر بات ختم کر دیتا۔ اور ارسلان کو نیرا
بھابھی کا ناقص انتخاب کہہ کر اپنے انتخاب پر فخر کرنے
والی آنسوؤں کے ہار پروٹے لگتی۔

وہ کبھی گھر آئے مہمان سے بطور ہو متعارف نہیں
کروائی گئی۔ نہ کبھی کسی گید رنگ میں یا فیملی فنکشن

میں شامل کی گئی۔ ویسے کے نام پر ممانے اپنے آبائی گاؤں کے چار معزز ہندے بلوا کر گھر پر ہی کھانے کا انتظام کیا تھا۔ شاید وہ اپنے بیٹے کی فطرت سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے اسی وقت ہی ٹھکان لی تھی۔ اور بیٹے نے بھی ہو بہو ماں کے اندازے کو درست ثابت کیا تھا شادی کے محض پانچ ماہ بعد ممان کی دوست یاسمین کی بے تحاشا خوبصورت رکھ رکھاؤ اور وقار والی بیٹی نینا سے اس کا سامنا ہوا اور وہ وہیں حقیقی معنوں میں دل ہار بیٹھا۔ اسے نینا سے مل کر انداز ہوا کہ جادو اثر حسن اور حشر سماں سراپا کیا ہوتا ہے۔ اور پھر عام سی شکل کی بے کاری لڑکی ربیعہ کو اپنی بیوی بتاتے ہوئے بھی اسے شرم محسوس ہونے لگی۔ چودھویں کے چاند کے سامنے ٹٹمٹاتا ہوا ننھا سا دیا کیسے نظر آتا۔ وہ اس کی ذات میں بے انتہا کیڑے نکالنے لگا۔ ممان بیٹے کے بدلتے تیور دیکھ رہی تھیں۔

”بیٹے! میں نے شروع سے یاسمین کی بیٹی نینا کو تمہارے لیے منتخب کر رکھا تھا۔ وہ گزشتہ چار سال سے لندن میں اپیشل انزیشن کرنے گئی ہوئی تھی۔ اس لیے تم سے ملوانے میں دیر ہو گئی کہو تمہیں کیسی لگی ہو بنا کر لے آؤں کیا؟“ انہوں نے لطف لے کر پوچھا۔

”اور کیا چاہیے ماما۔“ وہ مچلا ”مگر ماما وہ رنجہ۔“
 ”ارے اس دو کوڑی کی لڑکی کی کیا حیثیت ہمارے
 سامنے رکھنا چاہو تو گاؤں کے آبائی گھر میں بھیج دو۔
 بیٹھی کھاتی رہے گی وہاں تمہارے نام سے ساری عمر
 اور اگر تنگ آگئے ہو یا دوسری شادی کی راہ میں رکاوٹ
 بنے تو طلاق دے کر فارغ کرو۔“

اب ربیعہ کے پاس دو ہی راستے جلتی بچے تھے۔
بہت روٹی دھوئی عمر خان کو پرانی محبت کے واسطے بھی
دیے، مگر ادھر کون تھا سننے والا جو سامنے تھا وہ تو قطعی
بدلا ہوا، جیسی تیور والا ایک سنگدل انسان تھا۔

طلاق لے کر کہاں جاتی اور پھر اپنی اس بری طرح
ہاری ہوئی بازی کی کہانی کس کو سنائی مہرتی کیا نہ کرتی کہ
مصدقہ گاؤں میں عمر خان کی پہلی بیوی کے طور پر حویلی

میں رہا مفلوک و گریبا۔ آج کل وہ گاؤں جیسے کی جیڑواں
کر رہی تھی کیونکہ عمر خان اور فیسا کی شادی کی ٹیٹ
فلکس ہو گئی تھی۔

”بھابھی! امی سے کہنا مجھے معاف کر دیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بلک پڑی۔

”میں ختم ہو گئی ہوں، برباد ہو گئی ہوں اور اب...

اپنی جنت اجازت کر، ہمیں کہنا میری سزا کم کروں یا سن کی ناراضی اور اپنے کچھتاوے کا بوجھ سہارے کر۔

میری روح تھک کر چور ہو گئی ہے۔ میں ایک بار صرف ایک بار ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ انہیں کہہ دوں

اجازت دے دیں۔ آپ سفارش کروں میری آپ

نیرا کو اس کی بات پر جانے کیا کیا یا د آگیا۔

”میں ضرور ان سے کہوں گی۔“ اس نے اچھے ہوئے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ”تم فکر مت کرو۔“

”کہ اے مالک! گار منٹس کے آتش“

یہ لیا میاں کی کارسوس کی ذی ستاپ ہے
پیوی صاحبہ بچوں کے کپڑوں کی خریداری کر

کمرشل گئی ہوئی تھیں۔ کیا الطیفہ ہے بھئی۔“
واپس آئی تو ارسلان نے کھینچائی کی۔ آج اس

چھٹی تھی۔

میں نے لے لے مزید درستی کے لیے کمر شل

”نہا کر فریش ہو جاؤ پھر راول ڈیم چلتے ہیں۔“ اس نے بیگ رکھا۔

ارسلان نے قنات پروگرام بنالیا۔

”ہمیں میں فی الحال نصیہ اپنی طرف جائے رکھتی ہوں۔“

”نصیرو نہیں رقیبہ کو“ میری رقیبہ ہر وقت
 میرے گھر رہتی رہی۔“ وہ یسوار۔

”اچھا۔۔۔“ نیرا نے گھور کر دیکھا ”اور جو شے“

نہ جاؤں تو کون میرا سر کھانا ہے کہ پانی ضرور لگا آؤں۔“

”مگر اس وقت کیا ضرورت پیش آئی وہاں

عمر خان اور غصہ کی شادی کی خبر
 سے کہنا مجھے معاف کر دیں۔
 میں کہتا میری سزا کم کر دیں۔
 میں ایک سیارہ میں نہیں چاہتی ہوں۔
 آپ سفارش کر دیں میری آپ
 اس نے منت کی۔
 پر جانے کیا کیا یاد آگیا۔
 سے کہوں گی۔ اس نے
 پایا۔ ”تم فکر مت کرو۔“
 ہارمنٹس کی ذاتی شاپ ہے
 کے کپڑوں کی خریداری کرنا
 کیا لطیفہ ہے بھئی۔
 ن نے کھینچائی کی۔ آج اس
 پر جو سوٹ مجھے اچھے لگے
 برائے کے لیے کر شل
 لکھا۔
 پھر راول ڈیم چلتے ہیں۔
 کرام بنالیا۔
 نصیو آپا کی طرف جانے کا
 میری رقیبہ۔ ہر وقت
 سورا۔
 لہور کر دیکھا ”اور جو میں
 کھاتا ہے کہ آپا کی طرف
 ضرورت پیش آگئی وہاں

کی۔ ”جواب میں میرا نے ساری بات کہہ سنائی۔
 اس کے بعد وہ نصیو آپا کی طرف روانہ ہوئی۔ سب
 کچھ کہہ سنایا۔ بہت ساری سفارش بھی کی۔ سارا
 اور ماں کا دل گویا سمندر ہے ممتا کا۔
 وہ زار و قطار روئی گئیں۔
 اتنا روئیں کہ رات تک بلڈ پریش ہو گیا۔ ارسلان
 نے بھی ان سے رنجہ کی سفارش کی۔
 ”یہ ملاپ آپ کی صحت کے لیے بھی بہت ضروری
 ہے آپا! ایک ہی تو اولاد ہے آپ کی۔ کیوں اپنے آپ کو
 اندر سے ختم کیے جا رہی ہیں۔ چپ چاپ کھل رہی
 ہیں سات ماہ سے اس کی جدائی میں۔“
 بالآخر سات ماہ بعد رنجہ نے دوبارہ اسی مانوس اور
 ممتا کی خوشبو سے مہکتے آنگن میں قدم رکھا تھا۔
 ماں بیٹی کے ملاپ کا منظر بڑا متاثر کن اور دلخراش تھا۔
 جب سنبھلے بادل چھٹے تو ارسلان نے ہی تجویز دی
 تھی۔

”میں بھی تمہاری عمر ہی کیا ہے رنجہ! بائیس برس کی
 تو جوان لڑکی ہو۔ یوں اس شخص کے نام پر عمر بھر بیٹھے
 رہنے اور خود کو برباد کرنے سے بہتر ہے طلاق لے کر
 نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو، تمہیں اب بھی اچھا
 رشتہ مل سکتا ہے۔ میں خود کوشش کروں گا اور۔۔۔“
 ”نہیں ارسلان بھائی۔۔۔“ اس کا لہجہ دھیمہ مگر اٹل
 تھا۔ ”میں طلاق نہیں لوں گی۔“
 ”تو کیا باقی ماندہ زندگی اس دور افتادہ گاؤں کی ویران
 حویلی میں گزارو گی۔“ تیرا نے سرزنش کی۔
 ”ہاں۔۔۔“ اس نے آنسو پی لیے۔
 ”یہ سزا تو مجھے ملنی چاہیے تھی۔ جرم ہی اتنا بڑا ہے
 جو بیچ میں نے اپنے ہاتھوں سے بوئے ہیں ان کی
 آبیاری کرنا بھی میرا فرض بنتا ہے۔“
 ”مگر اس طرح کیسے۔۔۔؟“ تیرا نے خاموشی و دل
 گرفتہ بیٹھی نصیو آپا کی طرف دیکھا۔
 ”جو لوگ اپنی قسمتوں کے خود مالک بننے کی کوشش
 کرتے ہیں ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی
 ہوئی۔

”مگر اکیلے۔۔۔“

”اب میں اکیلی نہیں ہوں۔“ پھر اس نے ارسلان
 کی وجہ سے نظر جھکا کر آہستگی سے بتایا۔
 ”عمر خان کی نشانی میرے ساتھ ہے۔ بچہ ہو گیا تو
 اس کا ساتھ مجھے مضبوط کر دے گا اور اسی بچے کی خاطر
 عمر خان بھی گاؤں آتا جاتا رہے گا۔ آخر کو اس کی نسل
 کا خاتمہ ہو گا۔“

نصیو آپا کے چہرے پر سکون کی ننھی سی لہر دوڑ گئی
 تھی۔
 ”انی! کیا میں دوبارہ یہاں آسکتی ہوں۔“ جاتے
 جاتے اس نے جھجک کر پوچھا تھا۔

جواب میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نصیو پھوٹ
 پھوٹ کر رو دیں۔ رنجہ ان سے لپٹ گئی۔
 ”ماؤں کے گھروں اور دلوں کے دروازے بھی کبھی
 بند ہوا کرتے ہیں پگلی۔ ایک ماں کا رشتہ ہی تو سچا رشتہ
 ہے۔ اب خود ماں بن رہی ہے ناں! سب سمجھ میں
 آجائے گا، یا میں کیسے رہ سکتی ہیں ارے تم وہاں ایک
 آنسو بہاتی تھیں تو یہاں دو آنکھ سے ٹپکتے تھے۔“
 ”انی! یہ گاؤں کا ایڈریس ہے حویلی کا، مجھے ملنے
 ضرور آئے گا اور نیرا بھابھی آپ اور ارسلان بھائی
 بھی۔“

اس نے چٹ پکڑاتے ہوئے آنسو پونچھے اور
 بو جھل قدموں سے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔
 ”محبت کیا ہوتی ہے۔ آغاز بڑے بڑے دعوؤں اور
 قسموں سے ہوتا ہے اور انجام ٹوٹے ہوئے
 خواب بھیاں تک حقائق، کھردرے اور تلخ حالات۔“
 ”آؤ چلیں۔۔۔“ ارسلان کے کہنے پر وہ افسردگی سے
 سوچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔





تعارف

نورین حسی کی پیا پی

شازیہ جونسز

ہیں بظاہر مطمئن یوں تو اپنی جگہ لاکھ یہ چاہا کہ اس کو بھول جاؤں
ہے مگر اک نام پر بے گلی سی اپنی جگہ حوصلے اپنی جگہ ہیں' بے بسی اپنی

مستند میں غلطی اور غلطی کے لیے وہ اور مرزا بہت غصہ و غصہ کرتا
میں محبت میں ان کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا

چہ اس کی رائے میرے بارے میں بدل گئی ہوگی۔ اب بھی تو یہ نہیں کے دے کر آتا تھا تو اب شاید خوب چنگھتا رہا۔ میرے خدا! میں نے بھی ایسا نہیں کیا تھا اب بھی میرے بارے میں غلط انداز سے سوچے سمجھے لگے۔

اس نے پتھالی سے پیچ کے ٹکڑے صاف کٹے کاٹے
کے آگے آگے ایک کڑک کر اس نے غور سے دیکھا اس نے ہم
راستہ میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی کسی جگہ
دوڑی کے گرنے سے اس نے گرم ہوا کا آواز سنا ہے اس نے اس کے

صوفیوں کی قیادت میں اس وقت کے مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ سب اچھا تھا۔ لیکن ان کے اندر جو عقائد تھے ان کے خلاف نہیں کیا گیا۔ ان کے عقائد میں سے کچھ عقائد جو کہ غلط تھے ان کے خلاف نہیں کیا گیا۔ ان کے عقائد میں سے کچھ عقائد جو کہ غلط تھے ان کے خلاف نہیں کیا گیا۔

شہر کے کنٹینر میں ڈال دیا جائے گا۔
 'میں سمجھ نہ جانتے گا سمجھ رہا ہے' اس نے ایک نظر
 اسے دیکھا
 'دوستی سے پوچھ لیجئے' اس نے کہا کہ وہ کسی نہیں سمجھتی
 کوڑا

میں نے پانچ سو روپے دے دیے۔ وہ میری طرف سے ایک
 اچھی قسم کا تحفہ تھا۔ اسے تولیوں میں لپیٹ کر
 آج کوئی ایک دو تین دن کے بعد اس کے لئے لے
 جانے کا حکم ملا۔ اس وقت وہ بھی ایک ایسا ہی

گھر پر اچھی دھاری چم چلا کر کھڑے ہوئے
 سب سے پہلی بار کھڑی ہوئی، لیکن جب وہ چھوٹے بھائی کی
 دیکھا اس نے سب سے پہلی بار کھڑا ہوا تھا۔
 (اس کی پرورش میں تھا کہ وہ لڑائی لڑا کر کھڑی
 ہوئی تھی۔)

طرف زندگی کا کھینچا ہوا۔
 تھا اور وہ اتنی ہی تھی کہ وہ کھینچا ہوا تھا
 جانے دیکھ کر کھینچا ہوا تھا۔

ہاں! میں نے اس کی اجازت لی۔ جس کی سزا بھی وہاں کے
 لئے مناسب اور عاقلانہ فیصلہ تھے جو دوسرے کے
 بقول تھے: "اگر آپ صورت حال کو سامنے رکھیں
 تو یہ سزا بالکل ہی معقول ہے۔" وہاں کے قاضی نے
 یہ فیصلہ سن کر ہنس کر کہا: "میں نے یہ سزا سن کر
 ہنس کر کہی تھی۔ لیکن اب میں اس کی سزا سن کر
 ہنس کر کہتا ہوں۔"

ہوگی دیر نہ ہو رہی ہے
 اور گرم خرم ہوا کا قصہ
 اس کی ہر حرکت میں خیال اس عرشِ مہربا
 ہے جس کو بھی پریشان کیا تھا ہے وہ ہے خرم ہوا کی آواز

”کیا ایسا ہوا؟“ انہیں اس کی تشکیلات اور تجزیہ دہی نے سنا تھا۔

”ہاں“ اسی وقت انہوں نے جیسے دیکھا اور پھر عشق کے
غار میں چلا ہو گئے۔

”جی ایک ٹکی۔ کھیرائی کھیرائی، شہنائی شہنائی، جیسوم
 ہنگ۔ کس سے کس سے عشق ہو گیا ہے؟“ اس نے
 دوا کھانہ دیکھ کر ہنسی کی بجائے غصے سے کہہ دی تھی۔

اب جس کے دو کلف روپ، یہ کریمہ لڑکی کے ہوتی م
 دیکھئے۔
 ”تو کچھ زوراً غم بھائی کو میں نے تمہارے بارے میں
 سب بتا دیا تھا، دیکھتے ہیں کہ اس میں صرف تمہے فرض ہے۔
 تمہارے گھر سے نہ تمہاری فریاد ہے، نہ تمہاری سادی

گرومیں سارے ایسے اور خوفِ جان کریمیں ایسی خوب صورت اور حسین زندگی سے بہرہ ور محبت و تاجا ہے جس کی تم فارگوئی خودیہ۔" روئی کی تاجا اس کے اندر زندگی کا نشہ گھری تھیں۔ اس کا دل جو کل سے ایسی لہروں اور دھموں کی لہریں تھا، کیم شہا علیا جو کر دھارنے لگا تھا۔ ایسی خودیہ

سہرے بھری آس نے خوشی سے کلیاٹے ہوئے رومی کو کہے
 "سنو! وہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے تمہارا دل و کلام
 سب وہ اپنے جملوں پر سوری کستا جا چکے ہیں اور تم سے
 الگ ہو چکے۔"

اس نے پریشانی سے دوزخ کو دیکھا۔ حرم سے ملنا ممکن
 ہو گیا۔ اس نے کہا:۔۔۔
 میں باقی ہوں۔ مگر وہ نہیں جگے کہ جنت کرنے

ہمارے ساتھ۔ کل کچھ ہوا۔ کچھ بھی نہیں، آئندہ بھی
نہیں ہوگا۔" دوسری نے ہنسی رہا تھا۔

”میں نہیں دوست! میں نہیں اور ایسے دعوے کرے
 والوں کو نہیں دے سکوں گی۔“ وہ خوف سے کانپ گئی تھی۔
 کل تو بچت ہو گئی تھی۔ آج صبح
 پہلی محبت کرتی ہے اور ذرا ہی بھی ہے محبت کرے
 اے بہت مراد اور غر ہوئے چاہے کہ تک نہیں ملے!

کب تک؟ اس کو چھوڑ دو۔" جی فیلسفہ نے "تم غور کو روک سکتی ہو۔" سنہیل مکتی ہو۔" اس سے ملے اور اسے دیکھے بغیر نہ لوگی؟" رومی کے سوالوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ جج کہہ رہی تھی "صرف ایک طاقت" ایک دن میں اس کی

تو کہنے لگی۔
 "میں کیا کر رہی ہوں؟ یہ کیا ہو گیا روٹی! ایسا نہیں ہوا
 چاہیے تھا۔ ایسا نہیں ہوا چاہیے تھا" وہ اس سے ہٹ کر
 روئی۔

ہاں! جب سچ سمجھ کر ہی جانیں گے۔

چادر کی پر غار راہ پر غنائے کسی اس کی صفات کو کس نے
کئے لیے ایک قابلِ اعتماد دوست بھی ساتھ تھی۔

○●○

”خیر مجھے ڈر لگ رہا ہے، یہاں کسی نے دیکھ لیا تو؟“
وہ سہ سہکرائی ہوئی تھی۔ نرجس ہلکی بار بار اس کے ساتھ اس

عالمی شٹان اور خوب صورت یونٹس میں آئی تھیں۔ اس سے پہلے تین چار بار دودھ کی کھول پکے تھے۔ خرم کو جب اس سے ملنا ہوا تھا تو وہ دودھ کی کھول کے ذریعے پیام بھیجوا کرتا اور دودھ اسے کھانے سے ایک دو چمچ بڑے بعد کھلے آتی تھیں۔ یہ دودھ خرم سے کرا کر کھلتا تھا۔ کرا کر آتے، خرم ۱۲

خرم کی مستقبل کے ایسا سا مستقبل جس میں کسی کو
 اور پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ خرم اس سے محبت
 کرتا تھا اور وہ خود اس کی محبت میں روتی آگے بڑھتی جا رہی
 تھی، نہ مہروالوں کی سختی کی پروا ہی تھی نہ اس بات کی
 کہ

10

[illegible][illegible]

دیکھ لے ہے۔ بجائی البتہ تن کر کھڑا تھا۔ غرت سے دیکھتا

مکمل عمارت حرام دہا سے بہت اونچے آگے جڑا ہے
 کیسے یہی عزت ہو کہ اس میں وہ والی ہے جسے زندہ نہیں
 ہو سکتا۔ مگر اس کا رنگ اور لکڑی کی طرح ہوا ہے۔
 وہ پہنچے ہوئے دونوں اہل کو کہے کہ اس کے خود کو
 بنائے کہ کوشش کریں کہ یہاں وہ آگے جڑا ہو
 یکدم اسے نہ جانے کیا ہو اس نے وہ دونوں ہاتھ
 کے کرکے اسے بند کر دیا۔ اس نے کہا اور وہ سوتلی سے مار
 کھائے گی۔ وہ دو ہاتھ بچا کر نہیں دینے کی خود کو بچا
 کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ جسے وہ حرکت دیکھ کر بھائی کے
 ادا کر رہا ہے۔

”چھوڑ دو! ہمارے کیا حاصل۔“ صدرِ حکومت
اب اس کا ہندوستان کراچی پر گم ہو گیا۔ وہیں جہاں
کرتے ہو ”آگ“ دینے والے مسٹر چرچے اور آفیسر آف افسیروں
والے اہلکاروں کی بھیج کر لے گیا۔ ہندو دیو کی بیٹی بھی
آفس میں شہم کا ایئر اہلکار تھا۔ یہاں سے جیسے وہ جبر
میں بھیجی ہو، بے جان سودا گری کے ذات افسانے کی کوشش
میں ایک ممبر جس سے سوکھ سنا کار کا بھی کسی کے بولے
تک کی آواز آ رہی تھی۔

”جمل انھوں نے کہا کہ بہت دیر بعد نہ جانے کیسے اس کے قریب آئے اسے ہانڈ سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا وہ تجوزے حسرت تھی۔“

”جیل۔“ آپ اس نے اس کا باندھ ڈور سے کھینچا اور تقریباً تھپتی ہوئی اس نیم بے ہوش ”لوسٹن“ ہی نور کو اندر کمرے میں لے کر بستر پر لیٹا۔ اس کا سانس بے عمل مگسا تھا۔

اے کہ بہت بڑا ہوتا ہے جاکے ہی نہ ہوتا
 تیرے اس قدم سے تیرے گھر کو اور اسی کی تمام ہوا کے
 کوں تیرے اتنے کیسا کہ کیا ہو کر اس کے دور
 میں جس کی ہستی کو حسین کو اس کے ہی تیرے کیسا
 صاحب نے کی ہستی کو اس کے ہی تیرے کیسا
 کی عزت دیا کہ ہے کہ تو سب کو ہی تیرے تھے
 پرانی آراہی اور ہے جانی تیرے کا تھا اس میں
 آج بھی تیرے کے ہاں ہوتے ہیں وہ کیا ہے کہ
 میرا صاحب کے ہی تیرے ہی تیرے ہی تیرے
 اس کا ہر دور ہے کہ ہوتا ہے اس کے ہی تیرے

[illegible]

”دوستی کا کرنا ہے۔“ اس نے افسوس لہلہہ خاموشی سے
 غور کیا۔
 ”کیا۔۔۔ اس دوستی کا۔۔۔ اپنے اپنے لئے ہے؟“
 اے اے مسیح بھی کیا تھا کہ اس سے بغیرت سے نہ ملے گی
 کرکریں! ابھی میں دوسری ایسی کرکریاں سے چٹکا رہا ہے۔
 ”تجھے زیادہ کھانا“ نور تو نے کیا کیا؟“ اس کو دیکھا
 جیسے پچھتے گی۔ اس نے کھانا کھا کر کوئی دوسرا
 ”تو“ پر غصہ ہی کیا۔ کیا تو کو کھانا کھا کر دے گی
 تیرے دیکھ کر۔

”اماں ایسے مت رو۔ خدا کے لیے خود کو نہ بچاؤ۔
بے گناہ ہوں، پاک ہوں۔“ اس نے تڑپ کر اماں کے
تھام لیے۔

میں نے یقین کر لیا کہ میری زندگی کا۔۔۔ کون۔۔۔ اور کون۔۔۔
 ہے۔ تم نے میرا اپنے باپ اور بھائی کا نام تو دیا۔ میرا
 کچھ ضد کر کے بمشکل مجھے اجازت دے دو گی، تمہی کو تو کمال

[illegible]

اچھے روز جب انہوں نے اس کا گلابی میز داغ دیا
 تو وہ کہنے لگا کہ یہ باندی کا کہی تو وہ ایک بار
 اس کی تعریف کا سلسلہ شروع کر دیا ہوا تھا اس وقت
 اس نے کال کا پلٹا دیا۔ قاتل نے اس کی طرح کہی
 تو اس نے کہا کہ میں یہاں تو آیا ہوں کہ میری طرح کہی
 تو وہ دن یاد کر کے کہنے لگا کہ میں نے اس کی طرح
 کہی تھی تو اس نے کہا کہ اس طرح کہی تو وہ دن
 اس کی طرح کہی تو اس نے کہا کہ اس طرح کہی تو وہ دن
 اس کی طرح کہی تو اس نے کہا کہ اس طرح کہی تو وہ دن

اس وقت بھی وہ انھیں بند کیے چُپ چاپ بیٹھ ہو کر
 سو رہی تھی۔
 ”ایک بات۔“ یہ ہم خوف زدہ نہ ہوئی آواز اس
 کی۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ سب سے پہلی چیز
 ارب کھڑی تھی اس نے بے آبی سے اٹھ کر اسے
 دیکھ کر میری جانب تھم۔

”جی۔ تبستہ بولیں۔ اما کھرہ ہیں اور ابھی سوئے ہیں۔
 اور اے شوقیہ دیکھ کر آئی ہوں۔ آپ کھانا کیوں نہیں
 کھا رہی ہیں۔ کیا بھوکا مرنا ہے؟“

اسے اپنی محبوبہ بنوں پر بے پناہ پیار آیا۔ اس کی
 ہر بات کی تعمیل وہ اسی طرح دیا کرتا تھا۔ کچھ تک
 اس کی خدمت و دلالت وہ بھی کئی کئی محروم کے ساتھ ساتھ

میں نے کہا: "اے خدا! میں توڑتی ہوں۔"

ہم نے پتھرو سے بات کی ہے۔ اُن کے بیٹے حسن
شادی کر رہے ہیں۔ اتوار کو شہر ہے اور

میں نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس کے لیے

ہاں! چھوڑ دینا حسن ہے ہاں! پس نہ
کرتے والا عورت کو کم تر سمجھنے والا سخت ہے

قدیں رکھنے والا صنف۔ وہ بھی اس فصل کو بوسے سے
بھی نہ سوتی تھی۔ عبادت و اطوار میں اس کا نام پہلے تھا۔
”عمر بن عبد العزیز ایک نام رکھ کر۔“ ایک آدمی سے
فیضانِ نبوی کی ایک قطریں کا پوچھا کہ ایک آدمی سے اس کا
ابھی تیرہ سو روپے کی مالیت ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے اندر
ایک ہی آفت جاتی تھی رات کو ایک کھانسی دوتی کے تمام گوشہ
و گھوٹاں کی۔ تہہ کی طرف اس کا رخ کرتا۔ ایک آدمی
کہا۔ ”اس نے اپنے خوف و ہراس سے کھینچ لیا۔“
”قبائل سے اس کی سبک دانی سے پہلے ہی آدمی کی تم کو
دیا۔“ اس نے اس کی طرف سے کہا اور بھاگ گیا۔

اس کے اندر ایک حالات کی بحر کی تھی۔ اسی وقت
اس نے کاغذ، قلم، بیضا اور مدنی کو قلم حالات لکھ دیے
آفریح لکھا۔

”آپ میری زندگی اور تمام اُمیدوں کا محور صرف تم ہو مجھے اس سے کھٹو میں کسی بھی صورت میں حسن سے شاد نہیں رہوں گی۔ مجھے اس قید سے صرف تم نکال سکتے ہو۔“

۱۰۔ کلمہ کرور خاصا سلطان سی ہو مکتی تھی۔ اُسے بھین

کہ ہوتی کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔ حرم اس کے لیے

مات

...

...

سودی

14

14

کی بازی لگا دے گا وہ دھوکہ دہت میں امر ہوسنے کی باتیں کرنا تھا اس لیے کہ صرف اور صرف نوکر کی ذاتی سبب سے کہ جس نے وہی لکھو میں تین اور اب یہاں بیٹھتا ہے کہ محل خود نکالے گا اس نے دقت سے کہا تھا کہ وہ نوکر تو قسم والدین کو ان کے گھر کیسے جا کر وہ اس کا رشتہ ناگہان میں نہ جانے کین کرے گی مگر یہی وہ ضرور اسے جانے لگا کہ اسی آئینہ پر اس نے جو تھے کھانے کے بھی زہر مار دیے تھے حالات بدوں کے تھے۔ اپنا کمر ہی تھے

انکا پرانہ دن بھی اس وراس کے درمیان لگتے لگتے ہی تھا۔ خداوند نے نہت کرنا تھا

اس کا دل نہ یہ کہ ڈوب جا جا تھا ہوا کا کیا ہوسنے والا تھا۔ وہ دونوں ہی وہ لگا ہی تھی جیسے کسی نے جسم سے جدا فرما دیا ہو اور اب یہ تو برائی سناں کہیہ اور کامیابی سے کسی جانی تھی

بعض اوقات بہت دیر ہوتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ آئے والا وقت ہماری سوچ کے مطابق ہو سب کچھ ہمیں دکھانے سے ٹھیک آئے والے حالت نہ ہماری سوچ کے تاج ہوتے ہیں اور نہ خواہشیں کے اور خواہشیں کو ان سا پوری ہوتی ہیں۔ خدہ لب رہتے والی خواہشیں ملادی عمر کیسے کہتی ہیں۔

اس لیے نہ ہر جگہ کہ سر پہ کی پٹ سے نکالیا اس کے ساتھ کہ تو بھی ہوا تھا۔

پتا چلتی ہوئی کو کھلی گیا تھا یا میں عمر اس کی دھوکہ نہ تو خالی کی اور یہی غم!

اس نے آخری لحاظ تک کہنے کا میں نہیں جھوڑا

قلم پل لگتا تھا کہ وہ ابھی انہیں گھسے اس کے والدین اب کی سنت سناہت کر کے اس کا رشتہ ناگہان میں کے اور وہ

یہ خوشی تو قسم کے ساتھ اس کے گل لگا کر میں جانے لگا

کہ اس کے اور بھائی ہی اسے ضرور اور جگتے ہیں۔ یہ ان کی طرفوں میں بھی وہ خرچ ہو جانے کی بات کی جھین

رواؤ نے اس کی طرف کی تھیں اور کہ آجوں سے سرت اور

دان کرنا اس کے روز کی دنیا آئینہ آئینہ دی اور پھر یہ

اس وقت اگلے خبر ہوئی کہ جب بھائی چلو ہوا اس کے ساتھ

اسے عمر کو جس کے ساتھ کہنے کا وہاں لایا اس کی

دل کی تکی لپٹائی وہ باقاعدہ انکار دی تھی کہ اب غلام

کی بازی لگا دے گا وہ دھوکہ دہت میں امر ہوسنے کی باتیں کرنا تھا اس لیے کہ صرف اور صرف نوکر کی ذاتی سبب سے کہ جس نے وہی لکھو میں تین اور اب یہاں بیٹھتا ہے کہ محل خود نکالے گا اس نے دقت سے کہا تھا کہ وہ نوکر تو قسم والدین کو ان کے گھر کیسے جا کر وہ اس کا رشتہ ناگہان میں نہ جانے کین کرے گی مگر یہی وہ ضرور اسے جانے لگا کہ اسی آئینہ پر اس نے جو تھے کھانے کے بھی زہر مار دیے تھے حالات بدوں کے تھے۔ اپنا کمر ہی تھے

انکا پرانہ دن بھی اس وراس کے درمیان لگتے لگتے ہی تھا۔ خداوند نے نہت کرنا تھا

اس کا دل نہ یہ کہ ڈوب جا جا تھا ہوا کا کیا ہوسنے والا تھا۔ وہ دونوں ہی وہ لگا ہی تھی جیسے کسی نے جسم سے جدا فرما دیا ہو اور اب یہ تو برائی سناں کہیہ اور کامیابی سے کسی جانی تھی

بعض اوقات بہت دیر ہوتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ آئے والا وقت ہماری سوچ کے مطابق ہو سب کچھ ہمیں دکھانے سے ٹھیک آئے والے حالت نہ ہماری سوچ کے تاج ہوتے ہیں اور نہ خواہشیں کے اور خواہشیں کو ان سا پوری ہوتی ہیں۔ خدہ لب رہتے والی خواہشیں ملادی عمر کیسے کہتی ہیں۔

اس لیے نہ ہر جگہ کہ سر پہ کی پٹ سے نکالیا اس کے ساتھ کہ تو بھی ہوا تھا۔

پتا چلتی ہوئی کو کھلی گیا تھا یا میں عمر اس کی دھوکہ نہ تو خالی کی اور یہی غم!

اس نے آخری لحاظ تک کہنے کا میں نہیں جھوڑا

قلم پل لگتا تھا کہ وہ ابھی انہیں گھسے اس کے والدین اب کی سنت سناہت کر کے اس کا رشتہ ناگہان میں کے اور وہ

یہ خوشی تو قسم کے ساتھ اس کے گل لگا کر میں جانے لگا

کہ اس کے اور بھائی ہی اسے ضرور اور جگتے ہیں۔ یہ ان کی طرفوں میں بھی وہ خرچ ہو جانے کی بات کی جھین

رواؤ نے اس کی طرف کی تھیں اور کہ آجوں سے سرت اور

دان کرنا اس کے روز کی دنیا آئینہ آئینہ دی اور پھر یہ

اس وقت اگلے خبر ہوئی کہ جب بھائی چلو ہوا اس کے ساتھ

اسے عمر کو جس کے ساتھ کہنے کا وہاں لایا اس کی

دل کی تکی لپٹائی وہ باقاعدہ انکار دی تھی کہ اب غلام

کی بازی لگا دے گا وہ دھوکہ دہت میں امر ہوسنے کی باتیں کرنا تھا اس لیے کہ صرف اور صرف نوکر کی ذاتی سبب سے کہ جس نے وہی لکھو میں تین اور اب یہاں بیٹھتا ہے کہ محل خود نکالے گا اس نے دقت سے کہا تھا کہ وہ نوکر تو قسم والدین کو ان کے گھر کیسے جا کر وہ اس کا رشتہ ناگہان میں نہ جانے کین کرے گی مگر یہی وہ ضرور اسے جانے لگا کہ اسی آئینہ پر اس نے جو تھے کھانے کے بھی زہر مار دیے تھے حالات بدوں کے تھے۔ اپنا کمر ہی تھے

انکا پرانہ دن بھی اس وراس کے درمیان لگتے لگتے ہی تھا۔ خداوند نے نہت کرنا تھا

اس کا دل نہ یہ کہ ڈوب جا جا تھا ہوا کا کیا ہوسنے والا تھا۔ وہ دونوں ہی وہ لگا ہی تھی جیسے کسی نے جسم سے جدا فرما دیا ہو اور اب یہ تو برائی سناں کہیہ اور کامیابی سے کسی جانی تھی

بعض اوقات بہت دیر ہوتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ آئے والا وقت ہماری سوچ کے مطابق ہو سب کچھ ہمیں دکھانے سے ٹھیک آئے والے حالت نہ ہماری سوچ کے تاج ہوتے ہیں اور نہ خواہشیں کے اور خواہشیں کو ان سا پوری ہوتی ہیں۔ خدہ لب رہتے والی خواہشیں ملادی عمر کیسے کہتی ہیں۔

اس لیے نہ ہر جگہ کہ سر پہ کی پٹ سے نکالیا اس کے ساتھ کہ تو بھی ہوا تھا۔

پتا چلتی ہوئی کو کھلی گیا تھا یا میں عمر اس کی دھوکہ نہ تو خالی کی اور یہی غم!

اس نے آخری لحاظ تک کہنے کا میں نہیں جھوڑا

قلم پل لگتا تھا کہ وہ ابھی انہیں گھسے اس کے والدین اب کی سنت سناہت کر کے اس کا رشتہ ناگہان میں کے اور وہ

یہ خوشی تو قسم کے ساتھ اس کے گل لگا کر میں جانے لگا

کہ اس کے اور بھائی ہی اسے ضرور اور جگتے ہیں۔ یہ ان کی طرفوں میں بھی وہ خرچ ہو جانے کی بات کی جھین

رواؤ نے اس کی طرف کی تھیں اور کہ آجوں سے سرت اور

دان کرنا اس کے روز کی دنیا آئینہ آئینہ دی اور پھر یہ

اس وقت اگلے خبر ہوئی کہ جب بھائی چلو ہوا اس کے ساتھ

اسے عمر کو جس کے ساتھ کہنے کا وہاں لایا اس کی

دل کی تکی لپٹائی وہ باقاعدہ انکار دی تھی کہ اب غلام

وہاں سے اس نے اپنے ہاتھ پر لکھی کہ اللہ بھی اسے
کامیاب کرے۔ ان کے قلم کے واسطے یہ عزت نہ کرے۔ اس
کا نام اس کی ام سے نہ لے کر اس کی ام اور خود اس
کی عزت میں حاصل ہو کر فرض سے نہ بھگتا کہ اور
اس نے بھی شاید زندگی میں ایک بہت ہی بڑی اور دو
تک کے ساتھ ساتھ احسان سے بھی بھر کر اپنی اصلاح اور
بے بندوں کے بے خودی اس کا دل اور ان کے چہرے پر لکھی۔
اس کی حیرت کو اور دیکھ کر قریب علی علیہ السلام

"اے آپ نے بھی مجھے بڑے نیک قلبا عراس گھر میں
 کا احاطہ آپ کے ساتھ لائے والا لوگ اور میں
 تو کسی پہلی زندگی نے مجھے بھی طرح پرانا خاک
 کا قصہ کر کے اور اچھلے آپ کو اس قدر بے اعتبار
 ہیں۔ موت و حشر کا راز جان لی ہے۔ ابو
 علیؑ اور میں بھی شب کرتے ہیں۔ آپ تو مجھ کی ہیں۔"
 کے بعض خاص کی طرف

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

اسے دیکھ کر وہی سارے سین میں اس نے دن رات کے سانسے دیکھے تھے۔ ویسے ہی حالات رہنے کے ساتھ اس کی جوانی کے دور میں گزر چکے

اور اسے
تکسیر میں جس واقعہ کو دھوئے میں وہ روح تک
نہ ہوگی جس کو تکسیر میں اسی طرح روشن اور روح
میں اسی تکسیر میں جرم کرنے میں تکسیر
تکسیر میں تو تکسیر میں ایسا تکسیر کرتا ایسا تکسیر
میں ایک نور کے جسم میں جیل میں کر کے تکسیر کے تکسیر
نور تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر
تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر تکسیر

[illegible]

اور دوست کو تک غم کی شعلہ مل رہا ہے چاند
چشم میں ہے جرم تو یہ ہوا کہ میں اس کے
پہ گھر سے بھاگ چلی یا آپ کو کوئی عذر
"دوہیل رہی تھی اور نورین منہ کھلے اس کی
چشم ہو چوچھ کہ رہی تھی چوچھ تھا اور یہ سب
چشم گمراہی کے اندر دست نہ تھی اور اس کے
نہیں میں گمراہ کر اس کو قبول کر لیا تھا۔

کی تھی اپنی ہندو سے شادی کرنا چاہتی تھی اور
 سامنے تھا۔ اس کے باوجود مضبوطی سے
 تھم جی ہوئی۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے
 سامنے اسے بھی خوف تھا کہ جس سے سوچ
 کے کہ جسی خود جی ہوئی تھی کہ وہاں
 اپنی زندگی کا کوئی ایک پلکا سامنے بھی اس
 جو اس کے لیے بدنامی کا باعث ہو گیا تھا

اعلیٰ کے بارے میں سب کو کیا تھا۔
 جس رات نوشی نے باپ سے بات کی، وہ بے اختیار
 ہی بیٹھی ہوئی اور دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے جیسے
 کہ حسن بھی اس کی جرأت کو دیکھ کر تعجب میں آئے
 کہ وہ اپنے صدمہ کے نتیجے میں کتنی شادی کرنا چاہتا تھا۔
 ”بولو“ اس کی آواز میں بڑا دل سنی پڑا تھا۔
 ”میں نے یہ حد طے کر لی اور کڑی نگاہوں سے لوگوں کو دیکھا۔
 یہی ہو گئی۔“

[illegible]

اور قوت سے اور ان کے گالوں پر رہے تھے جس
کوتائے کا بھی جو اس میں نہیں، اور اقلہ اس کی
اسے کھول دی تھی، لیکن کوئی کنگ نہ تھا۔ حیرت سے
وہ کو غور رہا جو اس کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔
کہ کوئی نہیں چپ چلی تھی جسے اس نے یہ بھی
سمجھ دیا۔ تھی جو اور قوت سے رہے دیکھا اور
وہ خود کا کاسہ کر دی تھی۔
تپ نے بیٹھ سے اُٹھ کر اپنے تہہ پہنچا۔

حضرت عیسیٰ اور مریم کو قتل نہ دی جائے۔ یہی
 باب کا کارہ اور عیسیٰ کا قتل ہے۔ آپ
 کی نظموں میں انتہائی کثرت ہے اور یہی عظیم انسان
 ہے جو مخلوق کے حقوق اور آپ کے فرائض کو کافی علم
 ہے۔ یہی عیسیٰ عیسیٰ ہے جس نے دنیا کو
 جو آپ نے دنیا میں پیدا کیا ہے۔ یہی عظیم انسان
 ہے جس نے دنیا کو عیسیٰ عیسیٰ کے قتل سے محفوظ

کچھ کالو یہی کہتا ہے کہ اس کی جگہ سے
بچے نہیں ہوں گے۔
جو وہ کہتا ہے حق ہے وہ اس کی جگہ سے
کے انہوں نے جگہ سے بچے لگے۔ یہاں تو انہوں نے
ایک اور جگہ سے بچے لگے اور یہ جگہ تو ایک ہی
جگہ ہے۔
میں نے انتہائی جگہ سے بچے لگے۔

[illegible]

”کون ہے وہ؟“ حسن نے بہت دیر بعد سر اٹھا کر دیکھا تھا اسے۔
 ”وہ؟“ وہ کچھ کہتے کہتے دیکھ کر ایک نظر ماں کو دیکھا۔

”میں امی کو بتا دوں گی۔“ اس کا بھر شرم سے چپکایا ہوا تھا۔ پھر وہ دیکھ گئی۔ ”اٹھ کر بھاگ دلی“ اس نے بغور حسن کو دیکھا پھر خود بھی اٹھنا چاہا مگر حسن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا۔ وہ خاموشی سے دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔

جہاں سے اٹھی تھی۔
 وہ کچھ دیر اسے دیکھ رہا پھر بے حد تہمت آواز میں بولا۔

”میں نوشی کی جرات اور اس کی صاف گوئی پر بہت حیران ہوں۔ وہ اتنی بے باور تو نہ تھی“ اسے یہ سب کہیے بولنا

”آپ؟“
 اور نے جھکے سے سر اٹھا لیا۔ ”وہی الزام ہے وہی عین۔ اب تو صاف گروہ بن چکے۔“

”سنو حسن۔ جو کچھ آج تمہاری بیٹی کہہ کر تھی ہے۔ وہ میرے الفاظ، میری تہمت برسر نہیں ہیں۔ میرے اندر بے باوری ہوتی تو آج سے پچیس سال پہلے اپنا دفاع کرتی مگر خاموش اس وقت بھی رہی اور اب بھی گھم۔ تمہاری بیٹی پرچی لکھی، ناشور اور تمام معاملات میں زیادہ باخبر ہے اور پھر اس کی پشت پر میں نہیں ہوں۔ میں تو بہت کمزور کمزور ہی عورت ہوں۔ اس نے تو بہت بڑا اور دنیا کا سب سے مضبوط سارا تھا ہے۔ وہ اپنے دین کو جانتی ہے اور سمجھتی ہے اور اسے معلوم ہے کہ وہ کیا حق رکھتی ہے۔ میرے بارے میں تم سو لفظ بھی کا شفا رہے۔ میری پچیس سال کی محنت اور رفاقت بھی تمہارے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ اسی لیے تاکہ میں کمزور ہوں اور کمزور لوگ کسی کی پشت پناہی نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے کہتے روئے گئی تھی۔ آج بھی وہ بدگمان تھا اور اسے اسی وقت کا خوف تھا۔

”او نہیں۔ تم لفظ سمجھتی ہو۔ میں تمہاری بیٹی کی جرات پر حیران بھی ہوں اور خوش بھی۔ اس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ جرم جو میں پچیس سال سے کرتا آ رہا تھا۔ جس کا تم نے بھی مجھے احساس نہیں دلاؤ۔ اس کا احساس آج اس نے اپنی ضرورت کے تحت مجھے دلاؤ۔ بعض اوقات انسانوں کو غلطیوں سے کچھ اور کچھ اصلاح ملتی پڑتی ہے مگر تم

نے واقعی کمزوری دکھائی اور تمہاری بیٹی بے باور رہی وہ ہم سے زیادہ ناشور اور با علم ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے غلط قدم اٹھانے کے بجائے ہمیں اپنا پورا جان کر سب بتا دیا اور ہم سے مدد طلب کی۔ میں ضرور اس کی خواہش پوری کروں گا۔ ہوا ہے میری نا انصافی کی غلطی اسی طرح ہو جائے جو میں نے کیے اور بیٹی کے دور بہانہ نہ رکھی۔“

وہ حیرت سے حسن کا اعتراف منہ سن رہی تھی۔ وہ شخص بھی کبھی اتنا نرم اور تہمت آواز میں بول سکتا ہے۔ یہ بھی نہ امت محسوس کر سکتا ہے۔ غلطی مان سکتا ہے۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا مگر آج برسوں بعد اس کے دل سے یہ نتیجہ نکلیں کیا تھا۔ جس نے اسے مسلسل غمیر کی جبین میں کر رکھا تھا۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اس نے ادا اک بہت بعد میں ہوتا ہے۔ اس نے بار بار سوچا تھا کہ اگر خرم کے ساتھ چلی گئی ہوتی تو زیادہ خوش مطمئن ہو جی۔ اس طرح انہیں والی زندگی نہ کمزوری ہوتی مگر آج لگ رہا ہے کہ اگر وہ خرم کے ساتھ چلی جاتی تو شاید عمر بھر بھائی عورت کا طعنہ جینے نہ دیتا اور وہ بھی سر اٹھا کر نہ کہتی ہو سکتی۔ لولا کے سامنے بھی نہیں۔ جبکہ آج اس کی بیٹی اس کا مان اور غمیر کیا تھا۔ یہ سب اتنا اچانک اور بے گن خوشی لے ہوئے تھا کہ اسے خواب سا لگ رہا تھا۔ ”حسن!“ وہ بے اختیار اس کے ہاتھ تھام کر کہہ گئی۔ اسے ذات کی شرح روٹی حاصل ہوئی تھی اور اس نے اور محبت کا گور۔

”بھئی بھئی کے اٹھارے سے کبھی کبھی پھر دل بھی جانتے ہیں۔ محبت اپنا آپ ضرور منواتی ہے۔ تم نے مجھے اپنی محبت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انہی بڑی اور زیادہ زور ہی دور دور رہتی تھیں اور تمہارے گرجے سے میں مطلب لیتا رہا۔ دیکھو ہماری بیٹی نے محبت کا حق اٹھا لیا اور جیت گئی۔ کبھی کبھی محبت کا استعمال ایسا بڑا بھی ایک محبت کے جرم نے اسے پچیس سال لذت میں گزار دیا۔ دوسری محبت نے اس لذت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ تو ایک محبت تھی۔“

”اُدھر دوسرے کرے میں نوشین ساری اٹھا کر تھی۔“